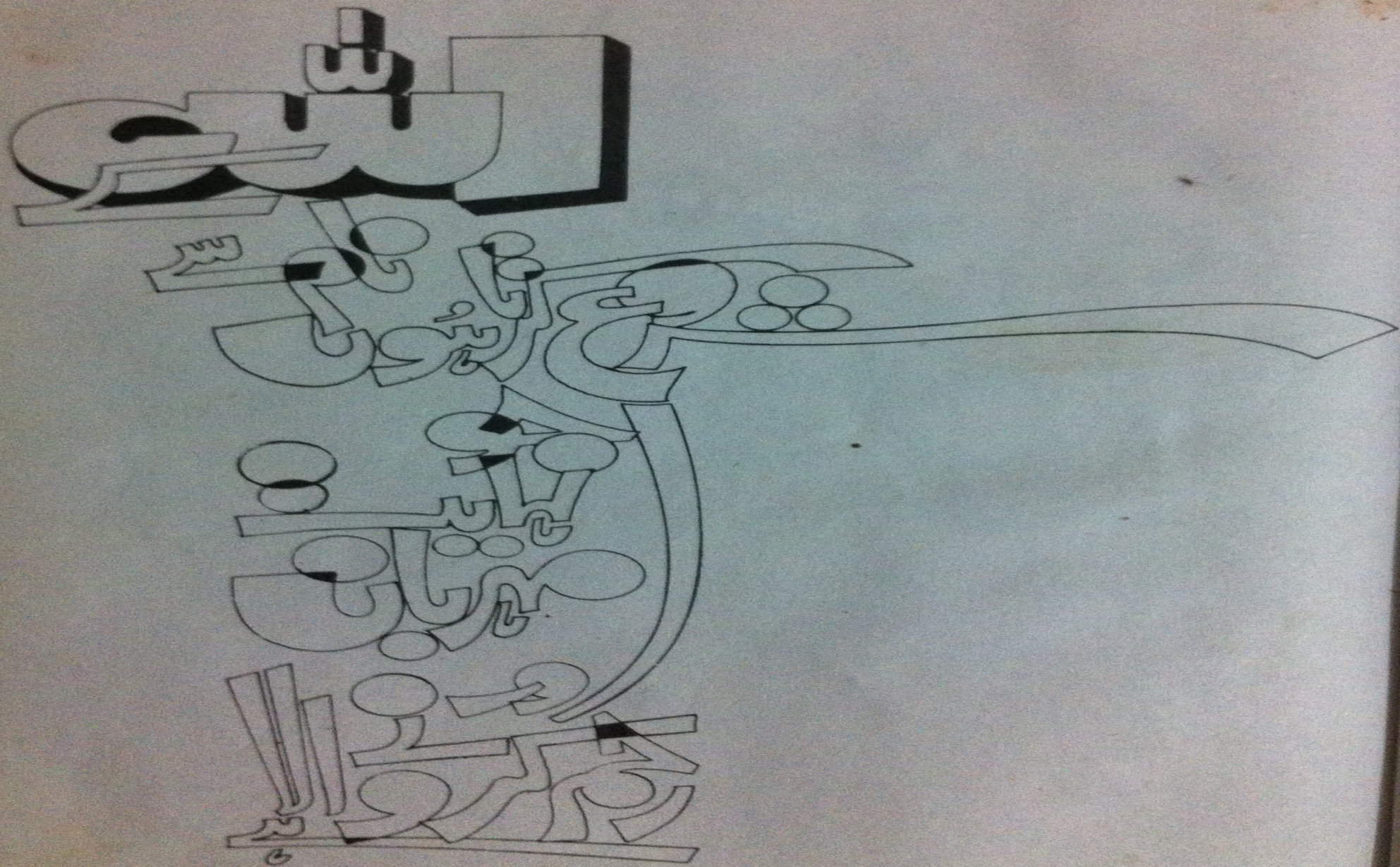


کشمیر کا شامین

عبدالسلام





گلبراز جنرل سٹور بیو

کشمیر کا شامین

عبداللہ

مرکز مطبوعات کشمیر



اشاعت اول

اپریل ۱۹۹۶ء

تعداد

۱۰۰۰

قیمت - ۹۵۰ روپے

۱۳۲ روپے

طالع

ایف آئی پرنٹرز

خورشید پبلش - راولپنڈی

ناشر

مرکز مطبوعات کشمیر

الاکرام بلڈنگ، مریڈ چوک مری روڈ

فون 504863

راولپنڈی



مجاہدین کشمیر کے

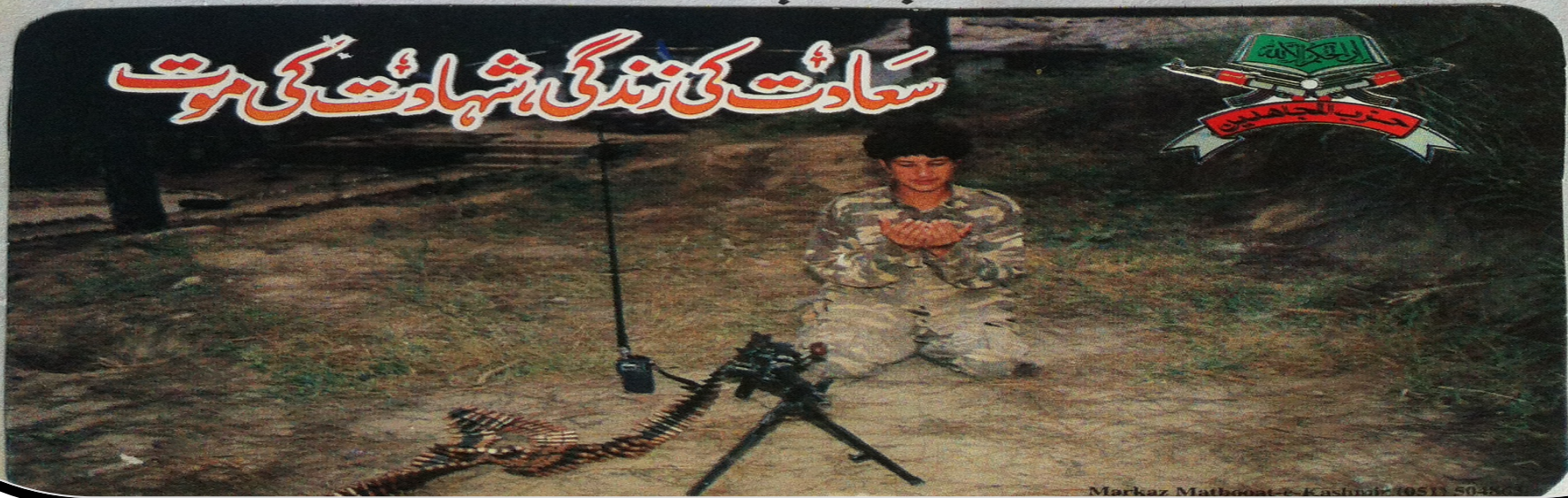
شانہ بشانہ تحریر و

تشمیر کے محاذ پر

سرگرم عمل

انتساب

ارض پاک کے ان سعید جوانوں کے نام
جنہوں نے
کشمیر کے جنگلوں، پہاڑوں، برف زاروں،
وادیوں اور میدانوں میں رضائے الہی کی خاطر
جان و جوانی لٹا کر
قومیت کے بت کو پاش پاش کر دیا



11	_____	اپنی بات	□
13	_____	دیباچہ	□
36	_____	قافلہ بلاخیز کا ہم سفر	□
47	_____	کنگن میں آمد	□
58	_____	ست پال کا انجام	□
72	_____	پھاڑوں پر نشیمن	□
89	_____	کنگن کے یادگار معرکے	□
125	_____	فوجی قافلوں پر حملے	□
143	_____	بارودی سرنگیں	□
156	_____	گاندربل گونج اٹھا	□
163	_____	نئے مہمان	□
172	_____	لداخ ہائی وے کا معرکہ	□
183	_____	موت کے منہ میں	□
189	_____	پھر میدان گرم ہو گیا	□
214	_____	جنگ بندی کے طالب	□
222	_____	بلوندر سنگھ کا چیلنج	□
		ارض پاک کی جانب	□

اپنی بات

علامہ اقبالؒ نے مسلم نوجوان کے اندر جس عقابی روح کی تمنا کی تھی، بشارت شاہین انہی تمناؤں کے بھر آنے کا نام ہے۔ وہ واقعی ایسا شاہین تھا، جو گنبد سلطانی پر ایک نظر ڈالنا بھی اپنی شان قلندری کی توہین جانتا تھا.... جسے پتھر لے جہادی مورچوں سے عشق تھا اور کار آشیاں بندی سے نفرت۔ اس نے اپنے لیے ایک رستے کا انتخاب کیا۔۔۔ ایک منزل کا تعین کر لیا تو پھر اس راہ عشق میں اپنی جان سے ہی گزر گیا۔ اسی طرح اس نے اپنے جذبے کی سچائی اور عشق کے راسخ ہونے کا وہ ثبوت پیش کر دیا جو ناقابل تردید ہے۔ وہ جذبہ جہاد سے سرشار کوئی جذباتی نوجوان نہ تھا۔۔۔۔۔ بلکہ فکر و آگہی کا حامل ایک ایسا مجاہد تھا جو جدید طریقہ جنگ کے تمام اصول و ضوابط سے واقف اور حالات کے مطابق نئے نئے طریقے دریافت کرنے والا عسکری ماہر تھا۔

اس نے اپنے جہاد کا آغاز افغانستان کے سنگلاخ پہاڑوں سے کیا۔ افغان مجاہدین کی پہلی صف کے لوگوں سے گوریلا جہاد کا علمی اور عملی سبق سیکھا۔ جہاد میں حصہ لیا اور شکر درہ کے ایک معرکے میں کمیونسٹ فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوا۔ اڑھائی برس تک کابل کی بدنام زمانہ پل چرخی جیل کی آہنی سلاخیں اور دہلا دینے والی مشق ستم بھی شاہین کے ذوق پرواز کو کم نہ کر سکی۔ کابل فتح ہوا اور پل چرخی جیل کے آہنی پھاٹک ٹوٹ گرے۔ افغان جہاد اپنے اختتام کو پہنچا تو کشمیر میں طبل جہاد بج اٹھا۔ شاہین جیسے مضطرب لوگوں کے لیے ایک درندہ ہوا تو دوسرا کھل گیا۔۔۔ اور پھر شاہین جولائی ۹۳ء میں ایک جہادی قافلے کے ہمراہ بلند و بالا برفانی

چوٹیوں کو سر کرتا ہوا کشمیر کی وادی جہاد و عزیمت میں اتر گیا۔
 شاہین کا تعلق پوٹھوہار کے مردم خیز خطے گوجران کے ایک نواحی قصبے
 سے تھا۔ اس کے اوالعزم والد نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں
 میں مردانہ وار حصہ لیا۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد وہ بھارت میں جنگی
 قیدی رہے۔ شاہین اسی مجاہد باپ کی گود میں پلا بڑھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ازلی
 دشمن سے انتقام کا جذبہ شاہین کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ اس جذبے نے
 اس کو مضطرب اور بے چین کر کے رکھ دیا تھا اور پھر یہی جذبہ اسے کشمیر کے میدان
 جہاد تک لے گیا جہاں اس نے جرات و بہادری، جان بازی و جاں نثاری کی عظیم
 تاریخ رقم کی۔

ستمبر ۱۹۹۵ء کے آخری دنوں میں وہ ایک عسکری گروپ کے ہمراہ دو سری مرتبہ
 کشمیر کے میدان جہاد میں اترے۔ ابھی وہ نئے معرکوں کی صف بندی میں مصروف تھا
 کہ سوناواری کے علاقے میں بھارتی فوج کے گھیرے میں آگیا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو
 اس نے زندگی کا آخری معرکہ بھی اسی بے مثال جرات اور استقلال سے لڑا جس
 کے لیے وہ مشہور تھا۔ اپنے تین دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ اس نے سوناواری کے
 قصبے کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا۔ سینکڑوں فوجیوں سے کئی گھنٹے تک اس کی
 معرکہ آرائی رہی، اس دوران اس کے تین ساتھی جام شہادت نوش کر گئے۔
 شاہین بھی شدید زخمی ہو چکا تھا، اس کا لہورگوں سے نچڑ رہا تھا، لیکن اس حالت میں
 بھی اس نے سینکڑوں فوجیوں کے گھیرے کو توڑا اور ثابت کر دیا کہ..... شاہین کبھی
 پرواز سے تھک کر نہیں گرتا.....

ڈانگر پورہ میں یہ زخمی شاہین دوبارہ پلٹ کر دشمن پر حملہ آور ہوا اور دو راکٹ
 فائر کر کے متعدد فوجیوں کو اصل جہنم کر دیا اور پھر اپنے سینے پر زخموں کے درجنوں
 تمنے سجائے اپنے ان ساتھیوں سے جاملے جو اس سے قبل اپنی نذر پوری کر چکے تھے۔

کوئی بھی اس کی شہادت پر حیران نہ تھا.... اگر شاہین جیسا بے قرار اور سیماب صفت مجاہد جام شہادت نوش نہ کرتا، تو حیرت کی بات ہوتی۔ وہ تو اسی گوہر نایاب کا متلاشی تھا۔ اسی کے لیے تو وہ کابل سے سری نگر تک سرگرداں رہا۔۔۔۔۔ کئی بار تو شہادت کی مہک اسے چھو کر گزر گئی۔ اس لیے کہ دو جہانوں کا رب اس سے اپنے دین اور جہاد کے میدان میں ایک عظیم خدمت لینا چاہتا تھا۔ شاہین جب وہ خدمت بہ احسن بجالایا.... اللہ کے مزدور نے اس کی راہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا، تو پھر اس کو اس انعام سے سرفراز فرما دیا گیا جسے حاصل کرنے کے لیے خالد بن ولید جیسی اعلیٰ مرتبت ہستیاں بھی تڑپتی رہیں.... مگر حاصل نہ ہوا۔

شاہین کی سرفروشیوں، شجاعتوں اور جراتوں کی ان گنت داستانیں کشمیر کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ وہاں سے آنے والا ہر مجاہد شاہین کے کردار اور اس کی بے مثال جرات کا اتنی عقیدت اور محبت سے ذکر کرتا.... اس کے ایسے ایسے کارنامے سنا تا کہ مجھے اس سے ملنے کی شدید تڑپ پیدا ہوئی۔ مجاہدین کا اصرار تھا کہ اس بے مثال مجاہد کی داستان شجاعت کو چند روزہ ”جہاد کشمیر“ کے اوراق کی زینت بنایا جائے۔ مگر شاہین نمود و نمائش سے بے نیاز کر گسوں اور زاغوں کے تعاقب میں تھا، وہ ہمارے زیر دام کیسے آتا۔۔۔۔۔؟ لیکن ایک روز محترمی صغیر قمر صاحب نے شاہین کو بڑی مہارت سے ”گرفتار“ کیا۔ پہلے تو وہ اپنی داستان جہاد سنانے سے بالکل ہی انکاری ہوا، لیکن ہمارے پے در پے دلائل کے سامنے وہ بالا خر ہار مان گیا اور اپنی کشمیریٹی ایک ہی نشست میں سنا دی۔۔۔۔۔ اور یہ شاید اس کی پہلی ”ہار“ تھی جس کے نتیجے میں اس نے ہمارے دلوں کو فتح کر لیا تھا۔

شاہین کی بعض عسکری کارروائیاں غیر معمولی جرات اور دلیری سے عبارت ہیں اور بعض قارئین کے نزدیک محیر العقول۔ ان ہی بے مثل کارناموں نے

شاہین کو غیر معمولی اور لازوال شہرت بخشی ہے۔ شاہین کی جراتوں نے بہت سے پاکستانی نوجوانوں کو کشمیر کے اندر جہاد کی راہوں پر سفر کرنے کی ترغیب دی اور ان کے شوق کو دو آتشہ کر دیا۔

جس دن شاہین نے اپنی داستان جہاد ریکارڈ کرائی اس سے اگلے روز وہ میدان جہاد کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس وقت ہمیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ..... اب کے پچھڑے ہیں تو شاید خوابوں میں ملیں..... شاہین کشمیر میں تھا جب اس کی داستان جہاد ”جہاد کشمیر“ میں شائع ہونا شروع ہوئی۔ اس دوران وہ شہید ہو گیا تو ہمارے قارئین کے لیے اس رواد کی اہمیت دو چند ہو گئی۔ اب انہی کے اصرار پر اس داستان کو ”کشمیر کا شاہین“ کے نام سے کتابی شکل میں آپ کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں ”جہاد کشمیر“ کے مدیر محترم عبدالہادی احمد کی رہنمائی قابل ذکر ہے، انہوں نے کتاب کے ایک ایک لفظ کو پڑھا اور گراں قدر مشوروں سے نوازا۔ مرکز مطبوعات کشمیر کے ڈائریکٹر جناب صغیر قمر نے نہ صرف اس کے لکھنے کے اسباب مہیا کیے بلکہ اس کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔ علاوہ ازیں میرے ساتھی محترم زاہد حسین قریشی نے بھی اس کتاب کی تحریر و ترتیب میں گہری دلچسپی لی اور اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہے۔ حزب المجاہدین جموں و کشمیر کے ڈپٹی سپریم کمانڈر جناب علی محمد ڈار نے کتاب کا پورا مسودہ پڑھا، تجاویز دیں اور کتاب کو حسن دینے میں مدد و معاون ثابت ہوئے۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر دے۔

خدا کرے میری یہ کاوش خواص و عوام کے معیار پر پوری اترے۔

عبدالسلام

راولپنڈی

۱۰ اپریل ۱۹۹۶ء

دیباچہ

تحریک آزادی کشمیر موجودہ نہج کے ساتھ اب ساتویں سال میں داخل ہو گئی ہے۔ اس دوران نصف لاکھ کے قریب لوگ بھارت کی سفاکانہ پالیسی کے نتیجے میں اس تحریک کی نذر ہو گئے۔ آزادی کی راہ میں شہید کیے جانے والے ہزاروں افراد ایسے ہیں جو بے کسی اور بے بسی کی موت مارے گئے۔ ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو تاریک راتوں میں تہ تیغ کیے گئے اور پتہ نہیں موت کے دروازوں پر انہوں نے کس قدر عزیمت کا مظاہرہ کیا ہو گا اور کس طرح مرتے مرتے بھارتی جلادوں کے اعصاب کو شل کیا ہو گا۔ البتہ ان شہداء میں سے ایسی اموات بھی ریکارڈ پر آئیں جو ہر آزادی پسند اور حریت کے متوالے کے لیے باعث رشک ہیں۔ ایسی ہی ایک موت کمانڈر شاہین شہید کے حصے میں آئی۔ پیدائشی طور پر مجاہد، کمانڈر شاہین دوبار مقبوضہ علاقے میں وارد ہوئے۔ مقبوضہ کشمیر میں قیام کے دوران بھارتی افواج پر حملوں کے لیے صفت سیماب ہمیشہ بے قرار رہتے اور آخر کار ایسے ہی معرکوں میں سے، خود بھی ایک معرکے میں کام آ گئے۔ شہید کمانڈر کی شہادت اس حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ ایک پاکستانی ہونے کے ناطے اس کا خون ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کے درمیان استوار رشتے میں مزید استحکام کا سبب بن گیا

ہے۔ کمانڈر شاہین کا خون ان لوگوں کے منہ پر طمانچہ ہے جو ریاست جموں و کشمیر اور پاکستان کو دو الگ جغرافیائی اکائیوں کی نظر سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ اگلے صفحات میں آپ کمانڈر شاہین کے ان کارناموں کا بتفصیل جائزہ لیں گے جو اپنی شہادت تک انہوں نے انجام دیئے۔ مصنف خراج تحسین کے لائق ہیں کہ انہوں نے ایک شہید کے کارناموں پر لکھ کر تحریک آزادی کشمیر میں قلمی محاذ پر اپنی شمولیت کو ثابت کیا۔ اس زمانے میں جبکہ قلم کی تقدیس کو خوشامدی قسم کے اہل قلم نے ”بڑے لوگوں“ کی قصیدہ خوانی سے پامال کیا اور قلم کے سوداگر بن کر مالی منفعت اور جلب زر کو اپنا منتہائے مقصود بنایا، محض رضائے الہی کے حصول اور ملی مفاد کی خاطر کسی شہید کے کارناموں کو لوگوں تک پہنچانا بڑی عظمت کا کام ہے اور یہ عظمت کا کام خوش اسلوبی سے انجام دے کر مصنف نے اس ذمہ داری کو نبھایا ہے جو نہ نبھائی جاتی تو جہاد کشمیر کا ایک اہم باب چشم جہاں سے پوشیدہ رہ جاتا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ تذکرہ اپنے قارئین میں جہاد کشمیر کے تئیں نہ صرف ہمدردانہ جذبات کو ابھارے گا بلکہ ان میں شاہین شہید کی مانند شہ رگ پاکستان کو بچانے کے لیے اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے کی تڑپ پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرے جس کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے اور اسے اہل کشمیر کی آزادی کا ایک ذریعہ بنادے اور یہ مصنف کے لیے توشہ آخرت ثابت ہو۔

سید صلاح الدین احمد
سپریم کمانڈر حزب المجاہدین

قافلہ بلاخیز کا ہم سفر

جولائی ۱۹۹۳ء کے دوسرے ہفتے ہم وادی کشمیر روانہ ہوئے، تین روز تک ہمارا گروپ لائن آف کنٹرول پر ہی چلتا رہا۔ بعض ناگزیر مشکلات کی وجہ سے لائن عبور نہ کی جاسکی، تو یہ پروگرام چند روز کے لیے موخر کر کے ہم پیچھے آ بیٹھے۔ ۲۷ جولائی کو ایک بار پھر اس مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ہمارا گروپ چالیس مجاہدین پر مشتمل تھا۔ ان میں سے گیارہ کا تعلق پاکستان سے تھا، جب کہ باقی انتیس مقبوضہ خطے کے تھے۔

چودھویں کے چاند کی پہلی کرنیں ہر سو پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمارا گائیڈ اس علاقے کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ چلنے سے پہلے تمام مجاہدوں کو دو دو کے گروپوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ میرے ساتھی اٹھ مقام کے کمسن مجاہد منظور احمد تھے۔ کم سن ہونے کے باوجود اس مجاہد کا حوصلہ غیر معمولی تھا۔ اس نے کافی سامان اٹھا رکھا تھا۔ راستے میں کہیں کہیں اس کا سامان اٹھا لیتا تاکہ تھکاوٹ اسے معذور نہ کر دے۔ بارہ بجے شب ہم ایک چھوٹے سے نالے پر پہنچے۔ سب ساتھیوں کو بے پناہ پیاس لگی ہوئی تھی۔ یہاں پہنچ کر دیکھا کہ جمی ہوئی برف سے پانی گر رہا

ہے۔ سب ساتھی پانی پینے کے لیے لپکے، لیکن ابھی چند گھونٹ ہی لے پائے تھے کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا کا سکوت ٹوٹا۔ دشمن نے کہیں قریب ہی سے ہم پر حملہ کیا تھا۔ ہم بے خبر تھے اور بہت سی گولیاں ہمارے ساتھیوں کے جسموں میں داخل ہو چکی تھیں۔ میں نے دیکھا چند لمحوں کے اندر اندر ہر طرف خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ میرے بالکل قریب ننھے منظور کے جسم سے گرم گرم خون ابل رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا، بمشکل..... ”شاہین بھائی“ کہا اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کو اس کی منزل اتنی جلدی مل گئی تھی کہ وہ دل کے ارمان نہ نکال سکا تھا، اس لیے اس کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی۔ دوسری طرف دیکھا تو راولا کوٹ کے عامر حفیظ بھائی کا جسم خون میں نہایا ہوا تھا، وہ بھی ساکت پڑے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر دیر کے عطا الرحمان آخری ہچکیاں لے رہے تھے۔ تیمرگرہ کے وقار بھائی اور فیصل آباد کے ولید بھائی کی سانسیں بھی اکھڑ رہی تھیں۔ مقبوضہ وادی کے دو گمنام مجاہدوں کا خون بھی پاکستانی مجاہدوں کے ساتھ شامل ہو رہا تھا۔ اس طرح پانی کے اس ٹالے میں ہمارے سات مجاہدوں نے دیکھتے ہی دیکھتے جام شہادت نوش کیا۔

اس خونی رات نے ہمیں نہ صرف سات پیارے ساتھیوں سے محروم کر دیا، بلکہ ہمارے پورے گروپ کو بھی تتر بتر کر دیا۔ فائرنگ کافی دیر تک جاری رہی۔ میں ایک اوٹ میں چھپا ہوا تھا، اس لیے فائرنگ سے محفوظ تھا۔ سفر کے آغاز پر ہمیں ہدایت کی گئی تھی کہ گائیڈ کی ہدایات پر من و عن عمل کرنا ہے۔ اس موقع پر بھی میں انتظار ہی کرتا رہ گیا کہ کب گائیڈ ہمیں جوابی کارروائی کا حکم دے گا۔ خاصی دیر کے بعد فائرنگ ٹھنڈی پڑی، تو میں اپنی پناہ گاہ سے باہر نکلا۔ میرے بچ جانے والے ساتھیوں کا دور دور تک کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے شہیدوں کے لاشوں پر آخری نگاہ

ڈالی، آنسوؤں کے چند قطروں کا نذرانہ انہیں پیش کیا اور زیر لب آیات کریمہ کا ورد کرتا ہوا وہاں سے نکلا۔

ساتھیوں اور گائیڈ کے پچھڑنے کے بعد میرے سامنے اب دو راہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان جانے راستوں پر منزل کی طرف سفر جاری رکھا جائے اور دوسری یہ کہ واپس لوٹ جاؤں۔ کافی دیر تک گوگلو کی صورت حال سے دوچار رہنے کے بعد اچانک شہید ساتھیوں کے چہرے میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔۔۔

”اس مشن کو ادھورا چھوڑ کر کیوں واپس جا رہے ہو، جس کے لیے ہم نے اکٹھے سفر شروع کیا تھا۔ ہم نے اس جنگل کو اپنے خون سے لالہ زار بنا دیا، تم جان کیوں بچا رہے ہو۔ آگے بڑھو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔“

پھر فیصلہ کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔

اللہ کا نام لیا اور ایک سمت کا تعین کر کے چلنا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے تک ویران اور سنسان جنگل میں بھٹکتا رہا۔ کچھ اندازہ نہ تھا کہ کہاں ہوں اور کدھر جانا ہے۔ کسی تائید غیبی کا منتظر تھا کہ اچانک اپنے دو ساتھی مل گئے۔ یہ دونوں ساتھی مقبوضہ وادی کے تھے۔ ایک گھنٹے تک مزید چلتے رہے تو دو اور ساتھی آ ملے۔ اب ہم پانچ تھے۔ بکھرے سے پہلے گائیڈ نے ذکر کیا تھا کہ ہم اسی نالے کے ذریعے ایک جنگل میں داخل ہوں گے اور وہ جنگل ہمارے سفر کی ایک اہم منزل ہوگی۔ لہذا ہم نے اس جنگل کو سامنے رکھ کر سفر شروع کر دیا۔ مشکل یہ تھی کہ ہم جس پہاڑ کی ڈھلان پر سفر کر رہے تھے، چاند اس کے عقب میں تھا۔ اب ہمارے سامنے والے پہاڑ پر تو چاند کی روشنی پڑ رہی تھی، لیکن ہم اس سے محروم تھے۔ اندھیرے میں بار بار گرتے تھے۔ گہرے کھڈ اور جھاڑیوں کا سلسلہ بھی دور دور تک پھیلا ہوا تھا، جس

کی وجہ سے سفر بہت مشکل ہو گیا تھا۔ سب ساتھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے اور کھینچتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ بھٹک کر ہم جنگل کے بجائے ایک دوسری طرف جانکے۔

صبح چار بجے ہم بھوکے پیاسے تھکاوٹ سے چور ایک پہاڑی چوٹی پر کھڑے تھے۔ رات کی سیاہی سے اب دن کی روشنی نکل رہی تھی۔ پہاڑ پر بڑے بڑے پتھر تھے۔ اس جگہ ہی کمرسیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ ایک گھنٹے تک میں بھی تھکاوٹ دور کرنے کی غرض سے لیٹا رہا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، اس لیے کہ اب تک ہم خطرے میں ہی تھے۔ سورج کی نوکیلی کرنوں کے ساتھ میں اٹھا اور ایک ساتھی کو لے کر گرد و نواح کے علاقے کا مشاہدہ کرنے نکلا۔ میری نظر پہاڑ کے دامن پر پڑی تو دیکھا، وہاں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ خچریں چر رہی ہیں جن پر سامان لدا ہوا ہے۔ میں نے دور بین سے ان کا بغور جائزہ لیا، یہ دراصل بھارتی فوج کا کوئی سپلائی ڈپو تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ خچریں ایک قطار میں اس علاقے کی جانب روانہ ہو گئیں، جہاں سے ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ بیس فوجی ان کے ہمراہ تھے۔ جب کہ اتنے ہی فوجیوں پر مشتمل ایک گشتی فوجی دستہ بھی وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ ہم دیر تک ان خچروں کو دیکھتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نالے کے اندر داخل ہو گئیں اور ہماری نظروں سے او جھل ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے چند فائر سنائی دیے۔ میرے خیال میں یہ فائر ہماری اس پیکاگن کے تھے، جو ہمارے ایک شہید ساتھی کے پاس تھی، اب وہ بھارتی فوج کے ہاتھ میں تھی، شاید اسے ٹسٹ کرنے کی غرض سے فائر کیے جا رہے تھے۔

وہ جنگل جس میں ہم نے پہنچنا تھا، کافی دور دکھائی دے رہا تھا۔ اس تک پہنچنے کا واحد راستہ نالے کے کنارے واقع سپلائی ڈپو کے اندر سے گزرتا تھا۔ دن بھر ہم

اس پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے رہے۔ دو ساتھیوں کے پاس بچا کچھا کھانا تھا، جو ہم نے تقسیم کر کے کھایا۔ دن کے تیسرے پہر بوندا باندی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا بھی چلنے لگی۔ پروگرام کے مطابق ہم نے رات کے وقت اس کیمپ اور نالے سے گزرنا تھا۔ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے مدد و تائید کی دعا مانگی اور نیچے اترنے لگے۔ کیمپ ہم سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم کیمپ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ہم نے اپنے منصوبے پر از سر نو غور کیا۔ کیمپ نالے کے دونوں اطراف میں قائم تھا۔ نالے کا پل کیمپ کے وسط میں تھا، جس پر فوج نے بٹکر بنایا ہوا تھا۔ اس کا ایک حل تو یہ تھا کہ ہم نیچے سے نالے کو عبور کر لیں۔ جب نالے کا جائزہ لیا، تو اس کو پل کے بغیر عبور کرنا ناممکن دکھائی دیا۔ نالے کی شوریدہ سرلہریں شکار کی تلاش میں چیختی چنگاڑتی ہوئی گزر رہی تھیں اور مجھے ان کا شکار بننے کا شوق نہیں تھا۔ اس فیصلے کو منسوخ کر کے پل کے اوپر سے ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

رات دس بجے ہم کیمپ کے عقب میں پہنچے۔ میں نے ساتھیوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ میں بٹھایا اور خود کیمپ کا جائزہ لینے لگا۔ کیمپ اور اس کے آس پاس قائم مختلف بٹکروں کو بغور دیکھا، پھر ایک ساتھی کو لے کر کیمپ کے اندر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے میں کیمپ سے گزارنے کے بعد دوسرے ساتھیوں کو باری باری گزاروں گا۔ اس کیمپ کو عبور کرنے کے لیے ہمیں تین بٹکروں کے پاس سے گزرنا تھا۔ میں کیمپ میں داخل ہوا اور ایک بٹکر کے پاس پہنچ کر اوٹ میں چھپ گیا۔ مجھے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شمع جل رہی تھی جس کی دھندلی روشنی چند گز تک پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی میں یہاں سے گزرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرا ساتھی بٹکروں کو قریب دیکھ کر ایسا خوف زدہ ہوا کہ بجائے میری طرف

آنے کے واپس چلا گیا۔ میں اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ بے بسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد واپس ساتھیوں کے پاس پہنچا تو میرا ساتھی وہاں موجود نہ تھا۔ انہوں نے بتایا ایک شخص ہمارے قریب سے گزرا تھا، لیکن یہ سوچ کر فوجی ہو گا ہم نے اسے آواز نہیں دی۔ ہم حیران و پریشان ایک گھنٹے تک اسے ڈھونڈتے رہے، لیکن اس نے نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اب دوسرے ساتھیوں کو کیمپ عبور کرنے کی ترکیب اور ترتیب اچھی طرح بتا کر دوبارہ کیمپ کی جانب روانہ ہوا۔ اس مرتبہ میں خود پیچھے رہ کر ساتھیوں کو ایک ایک کر کے گزارنے لگا۔

ہم تمام ساتھی بخیریت کیمپ کا ایک حصہ عبور کر کے پل کے قریب نالے کے کنارے پہنچ گئے۔ پل سے چند گز کے فاصلے پر نالے کے کنارے ساتھیوں کو پتھروں کی اوٹ میں بٹھا کر میں خود پل پر بنے واحد بنگر کا جائزہ لینے نکلا۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ میں پتھروں کی اوٹ سے ہوتا ہوا بالکل بنگر کی پشت پر پہنچ گیا۔ چند لمحے وہاں ساکت کھڑا رہا۔ پھر محتاط انداز میں بنگر کے اندر جھانکا، جہاں ایک فوجی گن سینے پر رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔ اس بنگر کے علاوہ پل پر اور کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ دوبارہ ساتھیوں کے پاس پہنچا اور انہیں ساتھ لے کر خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔ پروگرام کے مطابق سب سے پہلے میں نے پل عبور کرنا تھا۔ ساتھیوں نے چند گز کے فاصلے سے فوجی پر گنیں تان کے رکھنی تھیں۔ میں نے بسم اللہ پڑھی اور پل پر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نالے کی دوسری طرف اتر گیا۔ اس کے بعد میں نے پوزیشن لے کر بنگر پر گن تان لی اور تینوں ساتھیوں کو ایک ایک کر کے پل عبور کروایا۔ نالے کے پانی کے زبردست شور کی وجہ سے ہمارے پل پر چلنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ چند گز کے فاصلے پر ایک اور چھوٹے سے نالے کو جو توں سمیت عبور کیا اور پھر پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے ہم کیمپ کی آخری

نکلڑ بھی عبور کر کے جنگل میں داخل ہوئے۔ جوں ہی ہم جنگل میں داخل ہوئے کچھ دور ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ ہمیں یہ خطرہ محسوس ہوا، کہیں ہمارا پانچواں ساتھی پکڑا نہ گیا ہو اور اس نے ہماری نشان دہی نہ کر دی ہو۔ میں نے اشارے سے ساتھیوں کو بکھر کر پوزیشنیں لینے کا حکم دیا۔ چند منٹ تک ہم ان کی آمد کا انتظار کرتے رہے، لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ فوجی گشت پر تھے اور جنگل میں سے نکل کر کمپ کی طرف چلے گئے۔

جنگل گھنا تھا اور چڑھائی بالکل عمودی تھی۔ ساری رات ہم گرتے پڑتے پہاڑ کی چوٹی کی جانب محو سفر رہے۔ نماز فجر کے وقت ہم چوٹی سے کچھ نیچے پہنچے۔ تھکاوٹ نے سب کو بے حال کر دیا تھا۔ اب ہم خطرے سے قدرے باہر تھے، اس لیے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ دو گھنٹے رکنے کے بعد ہم وہاں سے اٹھے تو جنگل کے ایک کنارے دامن میں پچاس گھروں پر مشتمل ایک آبادی دکھائی دی۔ پہلے دل میں خیال آیا کہ اس بستی میں جانا چاہیے۔ لیکن ہم ابھی کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ اسی جنگل میں سفر جاری رکھا۔ چلتے چلتے ایک چشمے کے کنارے پہنچے۔ سب ساتھیوں نے سیر ہو کر پانی پیا۔ پانی پی کر اٹھا تو میری نظریں انسانی پیروں کے نشانات پر پڑیں۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا ان ہی جو توں کے نشانات ہیں جو ہم نے پہن رکھے تھے۔ فوراً میرے دل میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ یہ تو یقیناً ہمارے ہی ہچھڑے ہوئے ساتھی ہیں، جو یہاں سے پانی پی کر گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم قدموں کے انہی نشانات کی راہنمائی میں چار پانچ کلو میٹر تک چلتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے۔

یہاں بھوک ایک تلخ حقیقت کی صورت میں سامنے تھی، لیکن اللہ نے پیٹ کے لیے غیب سے بندوبست فرمایا۔ ہمیں ایک جنگلی گھاس ملی جو کھانے میں نہایت

لذیذ تھی۔ اس کے بعد سارے راستے اس کے ذریعے پیٹ کی آگ بجھاتے رہے۔
 اللہ کا فضل یہ تھا کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر بھارتی فوجی نہیں تھے۔ اس لیے ہم اطمینان
 سے سفر کرتے رہے۔ ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ آخر ایک جگہ ہمیں
 دور سے اپنے ساتھی دکھائی دیے۔ وہ ایک درخت کے نیچے بارش سے بچنے کے
 لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ ان سے مل کر ناقابل بیان
 خوشی ہوئی۔ سب کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو نکل آئے۔ وہ پلوامہ کے مدثر اور
 صدیق تھے۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کو اپنی پیتا سنااتے رہے۔ ظہر اور عصر کی
 نمازیں ہم نے ایک ساتھ ادا کیں۔ اس کے بعد دور بین سے نیچے وادی کا جائزہ
 لیا۔ کچھ دور نیچے ایک چرواہا نظر آیا جو مال مویشی چرا رہا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس
 چرواہے سے ملتے ہیں۔ ممکن ہے وہ ہمیں راستہ بتا دے اور ہو سکتا ہے اس سے
 کھانے کے لیے بھی کچھ مل جائے۔

سہ پہر کے وقت ہلکی ہلکی بارش میں ہم نے پہاڑ سے نیچے اترنا شروع کر دیا۔
 میں نے برساتی اوڑھ کر بھارتی فوجیوں جیسا روپ دھار رکھا تھا۔ چرواہے کی نظر
 مجھ پر پڑی تو اس نے چھپنے کی کوشش کی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد وہ میرے ہاتھ
 لگا۔ خوف سے وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے گوجری میں اس سے فوجی کیمپ کے
 متعلق پوچھا تو اس نے اشاروں سے بتایا کہ یہاں قریب ہی بھارتی فوج کے دو کیمپ
 ہیں جن کے درمیان ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ان کیمپوں کے درمیان مسلسل
 گشت جاری رہتا ہے، اس لیے تم فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ چرواہا گونگا تھا۔ میں
 اسے اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا جو ایک محفوظ مقام سے یہ ساری کارروائی دیکھ
 رہے تھے۔ وہاں اس سے مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ چرواہے نے بتایا کہ اس
 کے ایک عزیز کو بھارتی فوجیوں نے مجاہدین سے تعاون کرنے پر بدترین تشدد کا نشانہ

بنایا اور آخر میں گلا کاٹ کر اسے شہید کر دیا گیا۔ اس نے اشاروں میں ہمیں یہ بھی بتایا کہ سامنے والے پہاڑ کی دوسری طرف مجاہدین بھی آپ کو ملیں گے۔ میں نے اسے دو سو روپے دیے اور کہا کہ ہمارے لیے کھانے کا بندوبست کرو، لیکن اس نے بے بسی کا اظہار کیا۔ مجھے بھی احساس ہو گیا تھا کہ یہ کام اس کے بس سے باہر ہے، چنانچہ اسے یہ تاکید کر کے کہ وہ ہمارے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے، ہم آگے روانہ ہو گئے۔

سرمئی شام رات میں بدل رہی تھی، تو ہم دوبارہ کمر کس کر سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ اب ہماری منزل وہ پہاڑ تھا جس کی طرف گونگے چرواہے نے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ چند کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد ہم ایک نالے کے قریب پہنچے۔ اس نالے کے قریب ہی ایک کچی سڑک بھی تھی۔ میں نے ساتھیوں کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑا اور خود آگے جا کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ نالے کو کہاں سے عبور کیا جا سکتا ہے، اور آیا یہاں کسی گشتی فوجی پارٹی کا آنا جانا تو نہیں۔ کوئی گھنٹے بعد واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سارے ساتھی وہاں سے جا چکے تھے۔ ایک دفعہ پھر میں بے یار و مددگار اور تنہا رہ گیا۔ دراصل یہ ساتھی میری ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے میرے جانے کے بعد اٹھے اور نالہ عبور کر کے دوسری طرف چلے گئے تھے، وہ شاید نالہ عبور کرنے کے بعد مجھے ڈھونڈتے رہے، اور پھر مایوس ہو کر آگے بڑھ گئے۔ جب کہ میں ایک گھنٹے تک دیوانوں کی طرح انہیں نالے کے اس طرف تلاش کرتا رہا، میری آوازیں اور سیٹییاں بھی نالے کے شور میں دب کر رہ گئیں۔ آخر کار بے بس ہو کر میں نے اکیلے ہی سفر جاری رکھنے کا عزم کیا۔ میں نے نالہ عبور کیا اور سامنے والے پہاڑ کی چوٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ آسمان پر گہری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، اس لیے چاند بھی راہنمائی

سے معذور تھا۔ ساری رات میں نے تنہا سفر جاری رکھا۔ گھنے جنگل میں ایک طرف فوجی درندوں کا خطرہ تھا تو دوسری طرف جنگلی درندے بھی قدم قدم پر موجود تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تھا کہ اس نے مجھے ہمت اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کی توفیق عطا کی۔

صبح نو بجے کے لگ بھگ میں پہاڑ کی چوٹی سے چند سو فٹ نیچے ایک ہموار جگہ پر پہنچا۔ رات بھر کے سفر نے تھکاوٹ سے برا حال کر دیا تھا۔ تھکان اور نیند کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے، کمر سیدھی کرنے لیٹا تو فوراً نیند نے آدبوچا۔ مشکل سے ایک گھنٹہ نیند کی ہوگی کہ کسی کے گانے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھا۔ اپنی گن سنبھالی اور چوکنا ہو کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے بیٹھا ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ چند منٹ بعد میں پتھروں کی آڑ لیتا ہوا کچھ اوپر چڑھا۔ ابھی میں نے پچاس گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں اوپر ایک بکر میں دو فوجی پہرہ دے رہے ہیں۔ ان سے پچیس گز مزید اوپر ایک فوجی پوسٹ ہے جس کا کچھ حصہ زمین کے اندر تھا اور تین چار فٹ زمین کے اوپر نظر آرہی تھی۔ یہ نئی مصیبت تھی۔ رات بھر کے تھکا دینے والے طویل سفر کے بعد اب عملاً ممکن نہیں تھا کہ دوبارہ واپس نیچے اتر کر کوئی دوسری راہ تلاش کروں۔ یہاں ٹھہرنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ ان کے درمیان سے ہی گزرنے کی راہ تلاش کروں۔ اس جگہ آڑ لینے کے لیے کچھ درخت بھی تھے۔ کافی دیر تک چند سو گز کے اس خطرناک راستے کو عبور کرنے کے لیے مختلف منصوبوں پر غور و خوض کرتا رہا، اس کے بعد بکر کی پشت سے گزرنے کا فیصلہ کر کے میں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیا۔ ایک درخت کی آڑ لیتا، چند لمحے وہاں رکتا، پھر تیز قدم اٹھاتا ہوا دوسرے درخت کی آڑ میں چلا جاتا۔ ہر درخت کے درمیان دس پندرہ گز کا فاصلہ تھا۔ بکر میں پہرے پر

موجود فوجیوں سے میں گزر گیا اور یہ اللہ کا فضل تھا کہ پوسٹ کے اندر تمام فوجی سوئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں پانی کی ایک نالی عبور کر کے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک وسیع گراؤنڈ کی شکل کا سبزہ زار تھا۔ تحریک جہاد سے قبل اس میدان میں گوجر اپنے مال مویشی چرانے کے لیے آتے تھے، لیکن اب اس میدان کے دونوں اطراف میں فوج کی پوسٹیں بنی ہوئی ہیں۔ اس میدان کے اندر بڑے بڑے پتھروں کی ایک لمبی قطار تھی۔ میدان میں پانی کی ایک نالی بھی بہہ رہی تھی۔ میں پتھروں کی آڑ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک قریب سے ہی کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے چھلانگ لگائی اور چند گز کے فاصلے پر ایک پتھر کی آڑ لے کر گن سنبھال لی۔ ذہن میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ فوجی گھات لگائے ہوئے ہیں، لیکن چند سیکنڈ بعد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ تو چوہے ہیں۔ دراصل اس میدان میں لال رنگ کے بڑے بڑے چوہے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ چوہے میرے ”استقبال“ کے لیے بلوں سے باہر نکل آئے تھے۔ میں خود پر ہنستا ہوا اٹھا اور میدان عبور کرنے کا مشکل ترین مرحلہ طے کرنے لگا۔

ابھی میں نے سبزہ زار کا نصف حصہ ہی طے کیا تھا کہ دیکھا ایک طرف سے دو فوجی آ رہے ہیں۔ وہ میرے قریب پہنچے، میں سانسیں روک کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ دل ہی دل میں اللہ سے مدد و تائید کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس دوران اللہ کی طرف سے خصوصی مدد آگئی۔ اچانک اس قدر دھند چھا گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور سمت کا تعین کر کے دھند میں سے ہی دوڑ لگا دی۔ میدان پر کورا جما ہوا تھا، جس پر دوڑنا بھی آسان نہیں تھا، لیکن اس تائید غیبی سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے چند منٹوں میں دو

سوگزن کا فاصلہ گرتے پڑتے خیریت سے پار کر لیا۔ دوسری طرف ایک کچا راستہ نیچے جا رہا تھا۔ مجھ سے دو سو میٹر دور ایک پوسٹ تھی لیکن یہ بھی دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ میں اطمینان سے اس راستے سے اترنے لگا۔ اب میرے سامنے ایک وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی۔ دن کے دس بجے میں اس خوبصورت وادی میں اتر رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد میں ایک ہموار جگہ پر پہنچا تو وہاں ایک لڑکا بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ جیسے اس کا کوئی بچھڑا ہوا عزیز اچانک مل گیا ہو۔ اس نے فوراً ایک دوسرے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ میرا پھو اٹھالے۔ میں اس سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔ اس نے بتایا کہ یہ لولاب کا علاقہ ہے۔ تعارف وغیرہ ہوا تو اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر دکھایا اور کہا کہ میرا بھائی بھی مجاہد ہے۔ میں نے غور سے فوٹو دیکھا تو اسے پہچان گیا۔ یہ شیر خان تھا جس نے البدر (افغانستان) میں مجھ سے تربیت حاصل کی تھی۔ میں اب کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ شیر خان کہیں اور گیا ہوا تھا۔ شیر خان کے چھوٹے بھائی نے مجھے ساتھ لیا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اس کا گھر اس جگہ سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر تھا۔ شیر خان کی وجہ سے وہ گاؤں میں اپنا مکان چھوڑ کر اس غیر آباد جگہ پر قیام پذیر ہو گئے تھے، کیوں کہ گاؤں میں ان کے مکان پر روزانہ چھاپے پڑتے تھے۔ شیر خان کے عمر رسیدہ والد اور دوسرے افراد نے مجھے بڑی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ گرم پانی سے میرے ہاتھ پاؤں دھلائے اور پر تکلف کھانا کھلایا۔ اس کے بعد اس کا والد مجھے لے کر ایک قریبی مقام پر چلا گیا۔ جہاں بڑے بڑے پتھروں کے درمیان ایک محفوظ پناہ گاہ بنی ہوئی تھی، یہ اس کے باپ نے شیر خان کے لیے تیار کر رکھی ہوئی تھی، تاکہ بھارتی فوجی اس تک نہ پہنچ سکیں۔ یہاں سونے کی تمام

ضروریات موجود تھیں۔ گزشتہ کئی دنوں سے نیند پوری نہیں ہوئی تھی، اس لیے میں لمبی تان کر سو گیا۔

شام کے آٹھ بجے میں بیدار ہوا۔ ایک بار پھر پر تکلف کھانے سے میری تواضع کی گئی۔ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے بھارتی فوج کے مظالم کے بہت سے واقعات سنائے۔ چھوٹے بچوں نے فوج کے ہاتھوں لگے ہوئے جسموں کے زخم دکھائے۔ انہوں نے بتایا فوج ان کے گھر سے انڈے اور مرغیاں بھی چرا کر لے گئی ہے۔ دیر تک باتیں کرنے کے بعد رات اسی پناہ گاہ میں گہری نیند سو کر گزاری۔

اگلے دن میں بھی شیرخان کے چھوٹے بھائی کے ہمراہ مال مویشی چرانے گیا۔ میں ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب میں سستانے کے لیے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں لیٹا ہی تھا کہ میری نظر سامنے کے پہاڑ پر پڑی۔ کچھ دور چند مجاہد نیچے اتر رہے تھے۔ میں مسرت کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ میں اٹھا اور ان کی جانب چل دیا۔ وہ میرے ساتھی سے میرے ہی بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس دوران میں ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی بانہیں پھیلا دیں، سب سے گرم گرم معانقہ کیا۔ یہ میرے ہی ساتھی تھے، جو دو دن قبل ایک نالہ عبور کرتے ہوئے مجھ سے ٹکھڑ گئے تھے۔ اس مرحلے پر دوبارہ ان سے ملنا معجزے سے کم نہیں تھا۔

بھوک اور تھکاوٹ نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ شیرخان کے گھر میں کھانے پینے کا راشن ختم ہو چکا تھا۔ اس کے والد نیچے گاؤں سے سامان خور و نوش لانے گئے ہوئے تھے۔ میں نے شیرخان کے چھوٹے بھائی کو کچھ رقم دی اور کہا کہ فوراً گاؤں جا کر کھانے پینے کی اشیاء لے آئے۔ میں نے اسے احتیاط

برتنے کی تاکید کی، کیوں کہ گاؤں میں جبروں کی سی نہ تھی۔ اس کے بعد اپنے مجاہد ساتھیوں کو لے کر ان کے گھر چلا گیا۔ اب ہماری تعداد پھر پانچ ہو گئی تھی۔ دیر کے حمزہ سنگریا بھی ہمارے ساتھ آ ملے تھے۔ خاصی دیر بعد شیرخان کا بھائی کھانے کی اشیاء لے کر پہنچا۔ عشاء کے بعد اس کے والد اور ایک مقامی مجاہد بھی آ پہنچے۔ انہوں نے شیرخان کا پیغام دیا کہ وہ گاؤں میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ ہم نے کھانا کھایا اور پھر مقامی مجاہد کی معیت میں نیچے گاؤں روانہ ہو گئے۔ شیرخان کے والد بھی ساتھ جانے پر اصرار کر رہے تھے، لیکن ہم نے انہیں گھر پر ٹھہرنے کو کہا۔

رات دس بجے ہم گاؤں کے کنارے ایک مکان میں شیرخان اور چند دوسرے مجاہدوں سے ملے۔ انہوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لسی اور دودھ سے ہماری تواضع کی۔ کافی دیر تک ان سے پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ شیرخان اب عسکری تنظیم ”البرق“ سے وابستہ تھا اور اس کے دیگر ساتھیوں کا تعلق بھی ”البرق“ ہی سے تھا۔ انہوں نے ہمیں بھی ”البرق“ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ لیکن میں نے کہا کہ سردست ہم بانڈی پورہ اور ملن گام جانا چاہتے ہیں۔ دراصل جب ہم وادی کی طرف روانہ ہوئے تھے، تو ہم نے بانڈی پورہ اترنا تھا، لیکن راستے کے واقعات نے ہمارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا اور ہم ایک دوسرے اور طویل راستے سے ہوتے ہوئے لولاب میں داخل ہوئے۔

”البرق“ کے مجاہدین نے رات ٹھہرائے پر بہت اصرار کیا، لیکن ہم جلد از جلد حزب المجاہدین کے نظم کے پاس پہنچنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے ان ساتھیوں کی فکر بھی تھی جو لائن آف کنٹرول پر ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ میں ان کے متعلق جاننے کے لیے بے چین تھا۔ چنانچہ دو گھنٹے کے آرام کے بعد شیرخان کے ہمراہ میں اگلے گاؤں روانہ ہوا۔ وائرلیس سیٹ کے ذریعے ہم نے راستے میں

مجاہدین کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ آدھی رات کے وقت ہم گاؤں کے اوپر جنگل میں پہنچے۔ میزبانوں سے ملے اور ایک مکان کی چھت پر بستر وغیرہ بچھائے اور سو گئے۔ اب ہماری تعداد ایک درجن ہو گئی تھی۔ صبح نماز وغیرہ ادا کی اور وائرلیس سیٹ کے ذریعے حزب المجاہدین کی مقامی قیادت سے رابطہ کیا۔ کمانڈر سعید اس علاقے میں حزب کے منتظم تھے۔ وہ بھی دن چڑھے پہنچ گئے۔ دن کو ریاستی انتظامیہ کا ایک اعلیٰ افسر بھی ہمارے پاس آیا۔ وہ تحریک جہاد کا مخلص اور ہمدرد تھا۔ وہ دیر تک ہم سے باتیں کرتا رہا۔ وہ ہماری آمد اور جہاد کی تحریک پر بڑا خوش تھا۔

کمانڈر سعید نے ہمیں ایک دوسرے گاؤں منتقل کر دیا۔ وہاں ہم دو دن رہے۔ اس کے بعد ہمیں ایک تیسرے گاؤں کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ایک اونچے پہاڑ کو عبور کر کے ہم اس گاؤں میں پہنچے۔ وہاں کے مجاہدین نے ہمارا پر جوش خیر مقدم کیا۔ اس گاؤں کے قریب ہی ایک فوجی کیمپ تھا، اس لیے ہمیں گاؤں کے باہر ہی ٹھہرایا گیا۔ ہماری وصولی کی پرچی پر دستخط کیے گئے۔ چند گھنٹے کے قیام کے بعد یہاں سے روانہ ہو کر ہم سرشام اگلے گاؤں پہنچے۔ وہاں کمپنی کمانڈر اجمل نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ مقامی مجاہدین رات کو قریبی جنگل میں سوتے تھے، اس لیے ہم بھی رات کو جنگل میں جا کر سو گئے۔ سوگام میں ہم تین دن رہے۔ اس دوران دو مرتبہ فوج گاؤں میں آئی لیکن جنگل کا رخ کرنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ ہر روز صبح ہم جنگل سے نکلتے اور نیچے گاؤں میں پہنچ جاتے۔ وہاں گاؤں کے مختلف گھرانوں سے پر تکلف ناشتہ آتا۔ اس گاؤں میں مجاہدین کا اس حد تک کنٹرول تھا کہ مغرب کے بعد وہاں مجاہدین کا راج ہوتا تھا۔ ہم بھی مغرب کے بعد قصبے کا چکر لگاتے اور پھر جنگل میں جا کر سو جاتے۔

یوم آزادی پاکستان قریب آ رہا تھا۔ لوگوں میں جشن آزادی منانے کے لیے

بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ یوم آزادی منانے کی تیاریاں اس طرح ہو رہی تھیں، جیسے عید کی آمد ہو۔ ان دو تین دنوں میں ساٹھ کے قریب مجاہد سوگام پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اس مارچ پاسٹ میں حصہ لینا تھا، جو پاکستانی پرچم کو سلامی دینے کے لیے چودہ اگست کے دن منعقد ہونا تھی۔ مجھے بانڈی پورہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ مجاہدین نے پریڈ میں شریک ہونے پر بڑا اصرار کیا، لیکن میں نے جانے پر اصرار کیا تو انہوں نے بادل ناخواستہ مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

ہم مختلف گاؤں سے ہوتے ہوئے بانڈی پورہ کی طرف گامزن تھے۔ راستے میں ایک جگہ فوج نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کی لیکن جب ہم قریبی جنگل میں داخل ہو گئے تو اسے جنگل میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ درد پورہ سے ہم نے بانڈی پورہ کا سفر شروع کیا۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں سے ہوتے ہوئے ہم بانڈی پورہ کے اوپر واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں گرمیوں میں ہی رونقیں ہوتی ہیں۔ یہاں بہت سے ٹہارے تھے۔ ان ہی ٹہاروں میں گوجروں کے علاوہ ساٹھ کے قریب مجاہد بھی مقیم تھے۔ اسی جگہ ہمیں اکبر بھائی کی شہادت کی خبر ملی۔ ہم نے ایک گھر کے افراد کو روتے ہوئے دیکھا، ہمارے پوچھنے پر انہوں نے کہا اکبر بھائی ہمارے گھر آیا کرتا تھا، وہ بہت پیارا انسان تھا۔ یہاں ہماری ملاقات لانچنگ کے شعبے کے موجودہ سربراہ طفیل بھائی سے ہوئی۔ یہیں پر وہ ساتھی بھی مل گیا جو دوران سفر فوجی کیمپ میں ہم سے گم ہو گیا تھا۔ اس کا نام لینٹھا تھا۔ یہ ایک پہاڑی مجاہد تھا جو چند ماہ قبل بھارتی فوج سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر گیا۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ہم نے چند گھنٹے گزارے۔ اس کے بعد وہاں کے لانچنگ انچارج عبدالرحیم نے ہمیں ساتھ لیا اور کنڈ گلی نامی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ شام کو ہم وہاں پہنچ گئے۔ مدثر اور صدیق جو کہ ہمارے ہم سفر

تھے، اب اپنے علاقے کو سدھار گئے تھے۔ کنڈگلی میں ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہاں راولا کوٹ کے طاہر اسحاق بھائی اور نذیر احمد کھوسہ سے ملاقات ہوئی۔ انہیں میں نے عامر حفیظ کی شہادت کی اطلاع دی۔ یہاں سے ہم بانڈی پورہ کی ایک نواحی بستی میں چلے گئے۔

ہم ایک رات محو خواب تھے کہ اڑھائی بجے کے قریب پہرے پر موجود مجاہد نے ہمیں جگادیا۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور پوچھا کیا بات ہے۔۔۔؟ اس نے کہا فوج کی درجنوں گاڑیاں کچھ ہی دیر میں گاؤں میں داخل ہونے والی ہیں۔ کمانڈر عبدالرحیم ہمارے ساتھ تھے، انہوں نے فوراً قریبی جنگل میں چلے جانے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ ہم نے گتیں سنبھالیں اور جنگل کا رخ کیا۔ گاؤں سے روانہ ہوتے وقت ہم نے علاقے میں موجود مجاہدین کو خبردار کرنے کے لیے سگنل کے طور پر دو تین فار کر دیے تھے۔ ابھی ہم نے جنگل میں چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک کرخت آواز سنائی دی۔

کون ہو تم۔۔۔؟

جنگل میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، آواز دینے والے کے نظر آنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اس لیے ہمارے لائچنگ کمانڈر عبدالرحیم نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے بلند اور پر اعتماد لہجے میں کہا:

”میں آرڈی ہوں۔“

”آرڈی سنگھ؟“

”ہاں آرڈی سنگھ...“

اچھا ٹھیک ہے۔ اپنی پوسٹ پر پہنچو...

دراصل فوج نے جنگل کو بھی قبضے میں لے رکھا تھا اور انہوں نے ہمیں بھی

اپنا ساتھی سمجھ لیا تھا۔ اس طرح کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ ہم نے پہلی بار ان کی آواز سنی تو انہیں کسی دوسری تنظیم کا مجاہد سمجھ لیا تھا۔ تاہم عبدالرحیم صاحب نے ان کو پہچان لیا۔ وہ بھارتی فوج کے بلیک کیٹس کمانڈوز تھے۔

ہم تیزی سے اوپر چڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک ہموار جگہ پر پہنچے، تو فوج کو ہمارا علم ہو گیا، لیکن ہمیں مقابلے پر تیار دیکھ کر فائر کھولنے کی جرات نہیں ہوئی۔ اتنی دیر میں ہم نے منصوبہ بندی کر لی تھی۔ ہمارا ایک ایک ساتھی اوپر آتا رہا، باقی اسے کوردینے کی پوزیشن میں بیٹھے رہے۔ اس طرح تمام ساتھی خیریت سے پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ وہاں مویشیوں کے لیے بنے ہوئے درجنوں مکان تھے، جن میں رات کا آخری حصہ اور اگلا پورا دن ہم نے قیام کیا۔

دن کو دوربین کے ذریعے ہم نے فوج کی نقل و حرکت پر اچھی طرح نظر رکھی۔ ہمارے دو تین راؤنڈ چلانے کا فائدہ یہ ہوا کہ علاقے میں موجود سوبکے لگ بھگ مجاہد نکلنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن چند مجاہد محاصرے میں پھنس گئے اور فوج سے جھڑپ میں ایک مجاہد شہید ہو گیا۔ درجن کے لگ بھگ فوجی بھی معرکے میں مارے گئے۔

یوم آزادی پاکستان ہم نے بانڈی پورہ میں منایا۔ اس روز علاقے میں عید کا سا سماں تھا۔ پورے علاقے میں سبز پرچموں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ رات کو ہر گھر اور گلی میں چراغاں کیا گیا۔ پاکستان کی محبت سے سرشار ہزاروں لوگوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا، اہل پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے مجھے خطاب کا موقع ملا۔ اس موقع پر میں نے انہیں ایک ترانہ بھی سنایا جس کو بہت پسند کیا گیا۔ اس ترانے کو وائرلیس کے ذریعے سری نگر تک سنایا گیا۔ اس کے بعد جب بھی مجاہدین ملتے تو سب سے پہلے اسی ترانے کی فرمائش کرتے۔

اس کے بعد ہمارا پروگرام سوپور جانے کا تھا، مگر ڈسٹرکٹ کمانڈر شاہد الاسلام نے ہمیں ایک دوسری اور اہم ذمے داری سونپ دی۔ انہوں نے کہا۔ ”بھارتی فوج کے ایک اعلیٰ افسر ست پال نے یہاں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ یوں تو گاندربل میں مقیم ہے، لیکن یہ تمام علاقہ اس کے ظلم سے محفوظ نہیں۔ اس کو فوری طور پر ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔“

ست پال بھارتی فوج میں کرنل کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ کالے رنگ، لمبے قد اور سفید بالوں والے ست پال نے چھوٹی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ مجاہدین کے روپ میں تحریک جہاد کے ہمدردوں کے گھروں میں داخل ہو جاتا اور ان سے پناہ طلب کرتا تھا۔ لوگ اس کی مکاری سے دھوکے میں آ جاتے۔ مجاہدین سے محبت اور عقیدت کی وجہ سے لوگ اسے گھروں میں بنی خفیہ پناہ گاہوں میں چھپا لیتے۔ کچھ دیر بعد پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت بی ایس ایف کا ایک دستہ اس گھر میں داخل ہوتا۔ ست پال ڈرامائی انداز میں پناہ گاہ سے باہر نکل آتا۔ اس کے بعد اس گھر والوں پر ظلم و تشدد کے وہ حربے استعمال کیے جاتے کہ خدا کی پناہ۔ اس طرح کے ڈرامے رچا کر ست پال نے بہت سے معصوم اور مظلوم افراد کو شہید کیا تھا۔ علاقے کے لوگ اس ظالم سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے اور دن رات اس کی موت کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔

حزب المجاہدین کے ضلعی کمانڈر شاہد الاسلام نے ہمیں ست پال کو انجام تک پہنچانے کا کام سونپا اور پندرہ دن کی مدت دی گئی۔ اب ہمیں اسے گاندربل میں تلاش کرنا تھا۔ شاہد بھائی ہمارے گروپ کے ساتھ ہی گاندربل روانہ ہو گئے۔ چونکہ یہ ہماری پہلی باقاعدہ کارروائی تھی، اس لیے اسے بخوبی سرانجام دینے کے لئے سبھی بڑے پر جوش تھے۔ راستے میں ایک گاؤں میں سستانے کے لیے کچھ

وقت کے لیے نہری علاقے میں واقع ایک بستی میں رکے۔ دور دور تک وسیع و عریض کھیتوں کے اندر بسے ہوئے، اس گاؤں میں ہم نے ایک گھر سے چائی پی اور سفر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دوران پہرے پر موجود ایک ساتھی نے ہمیں بتایا کہ آگے کے علاقے میں فوج گشت پر ہے، اس لیے ابھی اسی گاؤں میں رک کر فوج کے واپس چلے جانے کا انتظار کریں۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب ہم گاؤں کے باہر ایک گراؤنڈ میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ ہمارا ایک مقامی مجاہد ساتھی بشیر گاؤں سے نصف کلومیٹر دور جھیل کے کنارے پہرہ دے رہا تھا، اس نے دیکھا کہ چار افراد جنہوں نے فرنیس اور افغانی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں، ہاتھوں میں گنیں لیے چند گز دور ایک کشتی سے اترے۔ ہمارے اس معصوم ساتھی نے انہیں دیکھا تو دوڑتا ہوا ان کے پاس جا پہنچا اور ان سے کہا کہ آپ فوراً گاؤں کی دوسری جانب چلے جائیں، کیونکہ فوج کے آنے کا خطرہ ہے۔ مجاہدین کے بھیس میں وہ دراصل بھارتی فوجی تھے۔ بشیر ان کو پہچان نہ سکا، فوجیوں نے وہیں کھڑے کھڑے بشیر کو گولی مار کر شہید کر دیا۔

اپنے ساتھی کی شہادت کی خبر ہمیں بعد میں ملی۔ اس سے پہلے ہم نہر کو عبور کر کے گاؤں کی دوسری جانب محفوظ جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ ہم کافی دیر تک وہاں رہے۔ اس دوران ہمیں بشیر کی شہادت کی اطلاع مل گئی۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سب کیا دھراست پال کے ساتھیوں کا ہے اور یہ سب کچھ ست پال کی ہدایت اور منصوبے کے مطابق ہو رہا ہے۔ تازہ واقعے نے ست پال کو ٹھکانے لگانے کے ہمارے عزم کو مزید پختہ کر دیا۔ وہ رات ہم نے سوناواری کے ایک محفوظ ٹھکانے پر گزاری۔ اگلے دن ہم پہاڑی سفر کرتے ہوئے گاندربل جا پہنچے۔

یہاں ہم نے دیکھا کہ ایک طرف وسیع دلدلی علاقہ ہے، جس میں کہیں کہیں گھنے درخت اور جھاڑیاں بھی ہیں۔ مجاہدین کو ایسے علاقے میں بہترین پناہ گاہیں میسر ہو جاتی ہیں۔ اس کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے باغات بھی ہماری پناہ کی ضرورت پوری کرتے تھے۔ چند دن ہم نے اسی علاقے میں گھوم پھر کر گزار دیے۔ یہیں پر کمپنی کمانڈر سعید اور پلاٹون کمانڈر قیصر بھی ہم سے آ ملے۔ ہم نے مقامی لوگوں اور مجاہدین سے ست پال کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ پہلے وہ اس علاقے میں عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتا تھا لیکن اب اس علاقے سے اس کا شاذ و نادر ہی گزر ہوتا تھا۔ لہذا مزید وہاں رہنا بے کار سمجھ کر ہم چھندن چلے گئے۔ اس علاقے کی زمین بھی میلوں تک دلدلی ہے۔ اس دلدل میں بید و غیرہ کے گھنے جنگلات اگے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ پناہ گاہ بنا کر ہم چودہ ساتھی اس میں قیام پذیر ہو گئے، ہمارا ہدف اب بھی ظالم ست پال تھا۔

ایک روز گاندر بل کے ایک گاؤں سے ست پال کے تازہ مظالم کی اطلاع ملی۔ میں نے اس کی تازہ واردات کے بارے میں تفصیل معلوم کرنے کے بعد ساتھیوں سے ایک گھنٹے کی اجازت مانگی اور پھر ان کو بتائے بغیر اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ست پال ظلم میں مصروف تھا۔ میرے پاس گن کے علاوہ کچھ گرینیڈ بھی تھے۔ تین بجے کے قریب گاؤں میں پہنچا تو پتہ چلا کہ ست پال دس منٹ پہلے یہاں سے جا چکا ہے۔ یہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی کہ اچھا بھلا ہاتھ آیا شکار نکل گیا ہے۔ یو جھل قدموں سے شام کے وقت واپس اپنی پناہ گاہ پر آیا تو سب ساتھی میری تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں تھا، میں نے ادھر ادھر کا بہانہ کر کے ان کی تشفی کر دی۔

ایک مدت تک ہم گاندر بل کے مختلف علاقوں میں ست پال کو تلاش کرتے

رہے۔ صبح نکلتے اور شام کو واپس لوٹتے لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہ آتا۔ شاید اسے بھی اپنی ”اہمیت“ کا احساس ہو گیا تھا، چنانچہ وہ جس کیمپ میں قیام پذیر تھا، اس کے غیر معمولی حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے۔ کوئی پرندہ بھی وہاں پر نہیں مار سکتا تھا، کیمپ کے چاروں اطراف میں ملحقہ باغات اور دیگر مقامات پر فوج کا کڑا پھرہ دن رات رہتا۔ اس لیے کیمپ پر حملہ کرنا، آگ میں کودنے والی بات تھی۔ دوسرے کیمپ پر حملے میں ضروری تو نہ تھا کہ ست پال ہمارا نشانہ بھی بن جاتا۔

جہاد میں انتظار کے لمحے بڑے صبر آزما اور اعصاب شکن ہوتے ہیں۔ ست پال ہمارے ہتھے نہ چڑھ رہا تھا اور ہمارا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ دیگر ساتھی بھی اس بے کاری سے تنگ آچکے تھے۔ لہذا میں نے ایک مصروفیت ڈھونڈ لی۔ میں نے چھندن میں سکولوں کے طلبہ کو قریبی جنگل میں عسکری تربیت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سکولوں کے طلبہ بڑے شوق سے عسکری تربیت کے پروگرام میں شریک ہوتے۔ میں انہیں گن فارنگ کا استعمال، کرائنگ اور گرینیڈ وغیرہ پھینکنے کا ہنر سکھاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ سکول کے تمام بچے چھٹی کے بعد اپنے بستے اٹھائے میرے پاس پہنچ جاتے اور دو گھنٹے تک مجھ سے تربیت لیتے۔ اس دوران یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ سکول کے تربیت یافتہ بچوں کو ایک ایک گرینیڈ دیا جا رہا ہے اور وہ جہاں کہیں بھی ست پال کو دیکھیں گے، گرینیڈ اس پر پھینک دیں گے۔ اس افواہ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ست پال نے گھروں میں جانا چھوڑ دیا۔ جان کے خوف سے وہ مقامی بچوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ ست پال کے سپاہیوں کے ہاتھوں بعض ”مشتبہ“ معصوم بچے ظلم و تشدد کا نشانہ بھی بنے، لیکن ست پال کے دن کا سکون اور راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ اسے یہ بھٹک پڑ چکی تھی کہ مجاہدین ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ موت سے اتنا خوف زدہ ہوا کہ دو ماہ کی چھٹی

لے کر دہلی چلا گیا۔ اس کے یوں بیچ نکلنے کی خبر سے ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جلد یا بدیر اسے واپس تو آنا پڑے گا، لہذا اسے کیفر کردار تک ضرور پہنچائیں گے۔ اس علاقے میں مزید قیام غیر ضروری سمجھ کر ہم نے نظم سے کسی اور مقام پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ نظم کے مشورے اور حکم پر ہم نے کنگن کا رخ کیا۔

کنگن میں آمد

ضلع سری نگر کی تحصیل کنگن زیادہ تر پہاڑی علاقے پر مشتمل ہے۔ اس کے درمیان سے ایک بڑی ندی گزرتی ہے، جسے نالہ سندھ کہا جاتا ہے۔ اس تیز رندی کے ایک طرف سے سری نگر لداخ ہائی وے گزرتی ہے جو دفاعی لحاظ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ کنگن کی بستیاں نالہ سندھ کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ میلوں تک آباد ہیں۔ کنگن شہر تین کلومیٹر لمبائی اور ایک سے دو کلومیٹر چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ایک طرف جنگلات سے اٹا ہوا پہاڑ ہے۔ بعض جگہوں پر جنگل اتنا گھنا ہے کہ وہ سورج اور چاند کی کرنوں کو بھی زمین پر اترنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس پہاڑ کی بلندی تیرہ ہزار فٹ ہے۔ پہاڑ کے دو سری جانب سری نگر کا شہر آباد ہے۔ سامنے کی طرف دوسرے پہاڑ کی اونچائی چودہ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ اس پہاڑ پر اکادکا ہی درخت ہیں، تاہم یہ پہاڑ سرسبز ہے اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے حسن سے مالا مال ہے۔ بعض مقامات پر دونوں پہاڑوں کے درمیان آدھ کلومیٹر کی ایک تنگ وادی بن جاتی ہے۔ کنگن کا یہ پہاڑی سلسلہ آگے چل کر ایک طرف پہلگام کے خوبصورت علاقے سے جا ملتا ہے اور دوسری طرف اس

سلسلے میں ستر کلو میٹر دور امر ناتھ کا مشہور غار واقع ہے جو ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے۔ کنگن سے ہی نارہ ناگ کے تاریخی مقام کو بھی ایک سڑک جاتی ہے۔ نارہ ناگ میں پتھر کی بنی ہوئی بڑی بڑی دیگئیں ہیں۔ ان دیگوں کی گہرائی اور وسعت کا یہ عالم ہے کہ بیس افراد بیک وقت ان میں سما سکتے ہیں۔ قدیم دور میں یہ دیگئیں چٹانوں کو کھرچ کر بنائی گئی تھیں اور زمین کی کھدائی کے دوران دریافت ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق علاقے میں دیومالائی کہانیاں مشہور ہیں۔ ایک روایت ہے کہ دیو اپنے لیے کھانا ان میں پکاتے تھے۔ میں نے نارہ ناگ کی یہ دیگئیں دیکھی ہیں۔ نارہ ناگ سے آگے تلیل کا علاقہ ہے، جہاں سے ہوتے ہوئے پاکستان کے شمالی علاقوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

کنگن پہنچتے ہی دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہاں فوجیوں کی کثرت رہتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کنگن کا علاقہ بھارتی فوج کے خلاف کارروائیاں کرنے کے لیے ”جنت نظیر“ ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ لداخ ہائی وے ہونے کی وجہ سے فوجی گاڑیوں کے قافلے اکثر اس سڑک پر ریگ رہے ہوتے ہیں۔ حملے کے بعد قریبی جنگل پناہ دینے کے لیے ہر وقت تیار تھے۔ کنگن میں پہنچ کر ہم نے غنی ون کے علاقے کی ریکی کی۔ ہمیں بتایا گیا بھارتی فوج کا ایک کانوائے اکثر سری نگر سے لداخ روانہ ہوتا ہے جو طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اس مقام سے گزرتا ہے۔ مجاہدین کے حملے کے خوف سے چند گاڑیاں کانوائے کے آگے آتی ہیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو دو فوجی اتار کر چلی جاتی ہیں، تاکہ مجاہدین کے غیر متوقع حملے کا جواب دے سکیں اور کچھ دیر بعد گزرنے والا فوجی قافلہ خیریت سے گزر جائے۔ کنگن میں مقامی سیکشن کمانڈر غازی فاروق کے علاوہ دیگر پانچ مقامی مجاہد بھی ہمارے ساتھ تھے، جب کہ ہم پاکستانی مجاہدین کی تعداد چار تھی۔

اگلے روز دوپہر کے بعد ہم نے سڑک پر ایک مقام کو کارروائی کے لیے چنا اور اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کر لی۔ مقامی مجاہدین نے ہمیں مکمل معلومات فراہم کیں۔ ہم نے دو سو میٹر تار اور دس کلو بارود منگوایا۔ رات کی سیاہی چھانے لگی تو ہم تجویز شدہ مقام پر دوبارہ پہنچے۔ گینتی اور بیلچے وغیرہ ہم ساتھ لے کر آئے تھے۔ سڑک کو اس مقام پر کھود کر ہم نے بارود سے بھرا ایک ٹین اس میں فٹ کیا اور پھر اس میں تار رکھ کر اس کا دوسرا سر اسی زمین لے جا کر مکتی کے ایک کھیت میں پہنچا دیا۔ پانچ گھنٹے کی سخت مشقت کے بعد ہمارا کام مکمل ہوا۔ فجر کی اذان کے وقت ہم دو ساتھیوں کو بارودی سرنگ کے پیرے پر چھوڑ کر قریب ہی ایک ٹھکانے پر جا پہنچے، جہاں ہم نے چائے وغیرہ پی۔ سخت تھکاوٹ کے باوجود ہم متوقع کامیابی کے تصور سے مسرور تھے۔

اس مقام پر نالہ سندھ سڑک سے محض چند میٹر کے فاصلے پر بہتا ہے اور سری نگر کی جانب نصف کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بستی ہے۔ سڑک کے عقب میں بھی لوگوں کے گھرا دھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ وقت مقررہ پر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ اس مقام پر پہنچ گیا۔ اب ہماری تعداد بارہ تھی۔ سب ساتھیوں کو میں نے مختلف راستوں پر بٹھا دیا۔ چند مجاہدوں کو کورنگ کا کام سونپا اور دو ساتھیوں کو غنی ون کی طرف سے آنے والی سڑک پر بٹھایا اور میں چھ دیگر ساتھیوں کے ہمراہ نالہ سندھ کوپل کے ذریعے عبور کر کے دوسری طرف گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

سڑک کے کنارے پر نصف کلو میٹر کے فاصلے پر ایک عالی شان مکان تھا۔ گاڑیوں نے اس مکان کے پہلو سے نکل کر ہماری نگاہوں کے سامنے آنا تھا۔ سات بج کر چند منٹ پر پہلی گاڑی نمودار ہوئی۔ یہ بڑا ٹرک تھا، جسے بھارت میں شکتی مان کہا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے چند چھوٹے چھوٹے ٹرک (ون ٹن) اور جیپیں آتی

دکھائی دیں۔ حسب معمول گاڑی نے دو دو فوجی اتارنے شروع کر دیے۔ جوں ہی
 شکتی مان گاڑی بارودی سرنگ کے اوپر پہنچی۔ مکنی کے کھیت میں بیٹھے ہمارے
 ساتھی نے تار کو بیٹری سے ٹیچ دیا اور ایک زوردار دھماکے سے گاڑی کے پرچے
 اڑ گئے۔ گاڑی کے اوپر ایک فوجی مشین گن لیے کھڑا تھا۔ اس کی مشین گن کو ہم
 نے فضا میں اس طرح اڑتے دیکھا، جیسے کوئی کوا قلابا زیاں کھا رہا ہو۔ گاڑی کے چند
 ٹکڑے اڑ کر دریا میں گرے۔ گاڑی آگ کے شعلوں کی شکل میں تقریباً "بیس گزر
 دور تک بکھر گئی۔ دریا کی دو سری طرف ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے سے ہم یہ سب کچھ
 دیکھ رہے تھے۔ بارودی سرنگ کے پھٹنے کے ساتھ ہی شکتی مان کے عقب میں آنے
 والی جیپوں نے بریک لگائی۔ اس کے ساتھ ہی میرے گرینیڈ تھروور سے ایک گرینیڈ
 نکلا اور سیدھا ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے شیشے پر جا کر لگا۔ گاڑی سے چیخ و پکار کی
 آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان گاڑیوں کے پیچھے چار سپاہی آرہے تھے۔ دھماکے کی
 آوازیں سنتے ہی انہوں نے بھاگ کر پوزیشنیں لے لیں۔ دریا کے شور اور اچانک
 حملے کی وجہ سے انہیں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کیا کریں۔ دونوں دھماکوں کے بعد چند
 لمحے فضا میں سکوت طاری رہا۔ اب میں ان چار سپاہیوں کی تاک میں تھا۔ جو قریب
 ہی لیٹے ہوئے تھے۔ جوں ہی ایک سپاہی نے سر اوپر اٹھایا ادھر میں نے فائر داغ دیا۔
 گولی اس کے سر میں لگی اور تڑپنے لگا۔ اس کے دو سرے ساتھی بدحواس ہو کر اٹھے
 اور بھاگنے لگے تو میری کلاشن کوف کی گولیوں نے ان کا تعاقب کیا۔ گن نے کچھ
 اور فائر اگلے اور کچھ دور تک لڑکھڑانے کے بعد وہ تینوں بھی وہیں گر گئے۔ اتنے
 میں پیچھے سے آنے والی گاڑیاں بھی آ پہنچیں۔ ان پر سوار فوجیوں نے نیچے اتر کر
 مختلف اطراف میں پوزیشنیں سنبھال کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ مگر ان کی
 فائرنگ زیادہ تر ہوا میں ہو رہی تھی۔ ہماری طرف سے جواب میں چند فائر ہی کیے

گئے، کیوں کہ ہمارے منصوبے میں زیادہ فائرنگ کرنا نہ تھا۔

کارروائی تین منٹ میں مکمل کر کے ہم اپنی پشت پر واقع پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ جبکہ سڑک کی دوسری طرف کے ہمارے ساتھی بھی قریب کے جنگل میں گم ہو گئے۔ فوج کی فائرنگ بدستور جاری رہی۔ پہاڑ پر کئی سو میٹر اوپر چڑھنے کے بعد میں نے دور بین سے دیکھا تو فوجی گاڑیوں کے نیچے چھپے ہوئے اور سڑک کے کناروں پر پوزیشنیں لیے ابھی تک اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد کہیں جا کر فائرنگ رکی۔ اس کے بعد وہ قریبی آبادی میں گئے اور چند سویلین کو لے کر آئے۔ ان کی مدد سے لاشیں اکٹھی کیں اور واپس روانہ ہو گئے۔ وہ دن ہم نے جنگل میں فتح کا جشن مناتے گزارا۔ یہ جشن فتح بھی کیا تھا۔ خشک چنے وغیرہ کھائے، پانی پیا اور دل اس نشے سے سرشار ہو گیا کہ آج ہم نے بے کاری سے جان چھڑالی ہے۔ دل کو بہت ہی سکون ملا تھا۔

اگلے دن گاؤں میں گئے تو معلوم ہوا کہ شکتی مان گاڑی میں سوار سترہ فوجی واصل جہنم ہوئے ہیں، فوجی جیپ میں ایک کیپٹن مارا گیا اور دوسرے چار فوجی زخمی ہو گئے۔ تین پیدل فوجی گولیوں کا نشانہ بن کر واصل جہنم ہوئے۔ جبکہ کچھ فوجی زخمی بھی ہوئے۔ فوج نے سڑک کے قریب واقع مکان کے مالک ٹھیکیدار کو گرفتار کر لیا۔ اس کے علاوہ ایک گھر میں داخل ہو کر دو افراد پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے ہماری مدد کی ہے اور انہیں گولیوں سے اڑا دیا۔ وہ دونوں بے گناہ تھے۔ تاہم ان دونوں کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا اور یہ بھی کوئی چھوٹا ”جرم“ نہ تھا۔

اس علاقے میں فوج کے خلاف یہ پہلی باقاعدہ کارروائی تھی۔ اس لیے فوج پر مجاہدین کا ایسا خوف سوار ہوا کہ تین دن تک پیچھا ہمارا کا کریک ڈاؤن کر کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ ہم سب بخیر و عافیت کنگن لوٹ آئے۔

اس دوران میں نے دو ساتھیوں کو ایمونیشن اور اسلحہ وغیرہ لینے بیس کیمپ بھیجا۔
سترہ دن بعد یہ ساتھی ایک پیکا گن اور کافی مقدار میں ایمونیشن کے ساتھ واپس
پہنچ گئے۔ پیکا گن کی ہمیں شدت سے ضرورت تھی۔ اس کے بعد یہ پیکا گن کشمیر
کے قیام کے دوران میرے ساتھ رہی۔ گرینیڈ تھروں میں نے مجاہد ساتھی نذیر
کھوسہ کو دے دیا۔

اس کے بعد ہم نے کنگن کے مختلف علاقوں میں ایک ماہ گزار دیا۔ رات ہمیشہ
جنگلوں میں گزرتی اور دن کو مقامی آبادی میں چلے جاتے۔ وہاں کے لوگ بڑی محبت
اور عقیدت سے پیش آتے۔ ہماری خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ
کرتے۔ میں نے بچوں کو عسکری تربیت دینے کا سلسلہ یہاں بھی جاری رکھا۔ بچے
بڑے جوش و خروش سے تربیت میں حصہ لیتے رہے۔ ہماری کامیاب عسکری
کارروائی نے اس علاقے میں جہادی جذبوں کو مہمیز دی۔ لوگوں کے سر سے بھارتی
فوج کا خوف اتر چکا تھا اور تحریک آزادی سے ہمدردی کے جذبات پروان چڑھنے
لگے تھے۔

ایک ماہ بعد ہم گاندربل کے ایک قصبے لار چلے گئے۔ یہ بھی پہاڑی علاقہ ہے
اور کنگن سے اس کی سرحدیں ملتی ہیں۔ ایک روز ہم لار کے ایک گاؤں میں
مشاورت کے بعد کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے، ابھی ہاتھ ہی دھوئے تھے کہ
ایک ساتھی خبر لایا کہ 'مخبری ہو گئی ہے، فوج سیدھی ہماری طرف آرہی ہے۔ یہ
گاؤں پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ اس کے عقب میں بڑی بڑی چٹانیں اور اکاد کا
درخت ہیں۔ بڑی بڑی گھاس گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی گھاس کے اندر
سے ایک کچا راستہ اس گاؤں کی طرف آتا تھا۔ گاؤں کے قریب ہی ایک نالہ بھی
تھا۔ ہم نے فوراً سامان اٹھایا اور نالے کا رخ کیا۔ اس وقت آٹھ پاکستانی اور اتنے

ہی کشمیری مجاہدین میرے ساتھ تھے۔

اس دوران چند بھارتی فوجیوں نے گاؤں کے عقب میں واقع ایک اونچی ٹیکری پر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں سے گاؤں بالکل قدموں میں تھا۔ میں نے حبیب اللہ بخاری، اسد اللہ اور نذیر احمد کھوسہ کو ساتھ لیا اور ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ باقی ساتھیوں کو میں نے نالے کے اندر سے ہو کر اوپر جانے کا حکم دیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بڑی تیزی سے اوپر چڑھ رہا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دائیں طرف پچاس میٹر کے فاصلے پر چند بھارتی فوجی بھی تیزی سے اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی آڑ سے اچانک ہمارے سامنے آ گئے تھے جس کی مجھے توقع نہ تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی ایک بھارتی فوجی نے زور سے کہا۔۔۔۔!!

”ہتھیار پھینک دو۔“

یہ ایک لمبی مونچھوں والا بوڑھا فوجی حوالدار تھا۔ میں نے ایک جھاڑی کی اوٹ لے کر اپنا پستول نکالا اور احتیاط سے نشانہ لے کر فائر کیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ پتھروں میں لڑھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے ہم پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ بھارتی فوجی جو گاؤں میں پہنچ گئے تھے انہوں نے مارٹر گن سے نالے کی طرف شیلنگ شروع کر دی۔ اوپر جانے والے فوجیوں نے بھی فائرنگ شروع کر رکھی تھی لیکن میری پوزیشن محفوظ تھی۔ اپنے دوسرے دو ساتھیوں کو میں اوپر کی طرف روانہ کر چکا تھا۔ دوسرے ساتھی بھی خیریت سے کافی اوپر ایک محفوظ جگہ پر جا چکے تھے۔ اب میں اکیلا ہی نیچے رہ گیا تھا۔ میں پتھروں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں تھا۔ ایک آدھ فائر کرتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چڑھتا رہا۔ سوفٹ اوپر جا کر نیچے دیکھا تو ایک جگہ دو فوجی ایک پتھر پر کھڑے نظر آئے۔ میں نے پیرکا سے ان کا نشانہ لے کر فائر کیا، ایک فوجی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس دوران مارٹر شیلنگ بدستور

جاری تھی۔ پتھروں اور جھاڑیوں میں جہاں میں بیٹھا تھا، اس کے چند سوفٹ بالکل نیچے ایک مکان کی چھت پر ایک فوجی نے دائیں ہاتھ سے ایک خاتون کو پکڑ رکھا ہے اور بائیں ہاتھ سے ایک مرد کو۔۔۔۔۔ خود درمیان میں کھڑا چلا رہا ہے۔ ”ہاں ہاں اس پتھر کے پیچھے ہے۔۔۔۔۔ اسے مارو۔۔۔۔۔ مارو اسے۔“ اس کی آواز مجھے اچھی طرح سنائی دے رہی تھی۔ جو حوالدار میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اس کے چند ساتھی اب بھی مجھ سے چند میٹر کے فاصلے پر موجود تھے۔ یہ فوجی ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ میں ایک پتھر کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک فوجی مجھ سے چند میٹر کے فاصلے پر نمودار ہوا، اس کے پاس ایل ایم جی تھی۔ اس نے بالکل قریب سے ایک برسٹ مجھ پر دے مارا۔ میں نے اسے بروقت دیکھ لیا تھا، لیکن ظاہر ہے اس کے ہاتھ کو پکڑنا میرے بس میں نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضل فرمایا۔ ساری گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔ یہ فوجی اس کے ساتھ ہی ایک پتھر کی آڑ میں چلا گیا۔ میں نے پیکا گن سنبھال کر اللہ کا نام لیا اور اس پتھر کے اوپر چڑھ گیا جس کی اوٹ میں فوجی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک گز کے فاصلے سے اس کی کمر پر فائر کیا اور وہ اپنی ایل ایم جی سمیت نیچے لڑھک گیا اور دور تک اس کے گرنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ اس کے دوسرے ساتھی ابھی تک پتھروں کی اوٹ میں دبکے ہوئے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ موقع ایسا نہ تھا کہ میں ان کے قریب جا کر فائر کرتا، تاہم دیر تک میں انہیں للکارتا رہا، لیکن وہ باہر نہ نکلے۔

کچھ دیر بعد میں پتھروں کے درمیان ایک محفوظ جگہ پر لیٹا ہوا تھا، میری توجہ کا مرکز وہ فوجی تھا جس نے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر چلا چلا کر میری نشان دہی کی تھی۔ وہ اب بھی اس مرد اور خاتون کی آڑ لیے بڑے اطمینان سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے میرے زندہ بچنے کا یقین نہ تھا یا پھر وہ دو افراد کو یہ غمال بنائے

ہوئے مطمئن تھا کہ میں اس پر فائر کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ میں نے پتھروں کی اوٹ میں لیٹے لیٹے اپنی پیکا گن کی ریج پلیٹ کو دو سو میٹر کے فاصلے پر فٹ کیا اور اس فوجی پر گولی داغ دی۔ گولی سیدھی اس کے سینے میں لگی اور وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور پھر گر پڑا۔ مرد اور خاتون اس سے چھوٹے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دونوں اسی دوپہر ہمارے میزبان رہ چکے تھے۔

میں اب تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکا تھا۔ پٹھو کے علاوہ، چھ سو راؤنڈ اور پیکا گن بھی میں نے اٹھا رکھی تھی۔ پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ زبان پتھر کی طرح خشک ہو چکی تھی۔ میں مزید اوپر جانے لگا۔ ابھی تیس میٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ کیا دیکھتا ہوں اوپر کی طرف سے پندرہ فوجی آرہے ہیں۔ وہ مجھے ہی پیچھے کی طرف سے گھیرنے آرہے تھے۔ میں نے فوراً ایک پتھر کی آڑ لے کر ان پر ایک برسٹ مارا اور سامنے کے تین کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ باقی فوجیوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا اور وہ نالے کے ذریعے نیچے کی طرف بھاگنے لگے۔ اس نالے سے میں پہلے بھی ایک دفعہ گزر چکا تھا اور اس علاقے کا واقف تھا۔ جب وہ فوجی دور چلے گئے، تو میں نے ایک بار پھر اوپر کا رخ کیا۔ راستے میں ان تین فوجیوں کے پاس سے گزر ہوا جو میری گولیوں کا نشانہ بنے تھے، وہ تینوں اگلے جہان پہنچ چکے تھے۔

جھڑپ شروع ہوئے تین گھنٹے گزر چکے تھے اور فوج کو تازہ دم کمک پہنچ چکی تھی۔ اس لیے مزید اس جگہ رکنا قرین مصلحت نہ جان کر میں نے جنگل کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ دوسری جانب سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اس لیے کبھی کبھار میں بھی ایک آدھ فائر کر دیتا تھا۔ راستے میں مجھے دو نو عمر لڑکے مل گئے۔ پہلے تو میں انہیں بھی بھارتی فوجی سمجھا، لیکن جب وہ ڈرتے ہوئے سامنے آئے تو معلوم ہوا مقامی لڑکے ہیں۔ میں نے حوصلہ دلاتے ہوئے انہیں گلے لگایا اور پھر ان کو ساتھ

لے کر اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جلد ہی اپنے ساتھیوں سے ملاقات ہو گئی، وہ بھی اللہ کے فضل سے خیریت تھے۔ سب نے مل کر میرا استقبال کیا۔ ہم نے مقامی لڑکوں کو گاؤں بھیج دیا، جنہوں نے گاؤں میں جا کر لوگوں کو ہماری خیریت اور دشمن کی ہلاکتوں کے بارے میں بتایا۔ مغرب کی نماز کے بعد بہت سے لوگ کھانے پینے کے سامان سمیت ہمارے پاس آ پہنچے۔ ان کی زبانی اس معرکے کی بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مغرب سے قبل بھارتی فوجی لاشیں سمیٹ کر چلے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک بار پھر ہم اس گھر میں جا پہنچے جہاں سے ہمیں دوپہر کا کھانا کھائے بغیر نکلنا پڑا تھا۔ وہی کھانا ہم نے دوبارہ گرم کر کے کھایا اور رات گئے تک وہاں بیٹھے رہے۔ مقامی لوگ بھی ہمارے پاس آ بیٹھے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اسی دوران ہمیں ایک دلچسپ واقعہ معلوم ہوا۔ دوپہر کے وقت ہمیں گھیرے میں لینے کے لیے ڈیڑھ سو کے لگ بھگ جو فوجی آئے تھے، ان کی قیادت ایک میجر کے ہاتھ میں تھی اور اس کا معاون ایک کیپٹن تھا۔ خلاف توقع جو ابی فائرنگ کا آغاز ہوا تو میجر اس قدر خوف زدہ ہوا کہ وہ چپکے سے کھسک کر قریبی گھر میں گھس گیا جس میں اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ ”بہادر میجر“ خاموشی سے ایک پلنگ کے نیچے چھپ کر لیٹ گیا۔ اس وقت دن کا ایک بجاتا تھا۔ کیپٹن کو اپنے میجر کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا۔ وہ دن بھر یہ سمجھ کر لڑائی میں مصروف رہا کہ ان کا کمانڈر کسی دوسری جگہ پر ہے۔ باہر سے فوجی کمک آئی تو دوسرے افسر نے کمان سنبھال لی۔ سہ پہر کے وقت جھڑپ ختم ہوئی اور یہ فوج واپس چلی گئی۔ میجر اسی گھر میں چھپا رہا۔ گھر کے افراد شام گئے کھانا کھانے کے بعد جب اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں میجر چھپا ہوا تھا تو اچانک پلنگ کے نیچے سے نکل کر اس نے پستول نکال کر سب کو

ہینڈ زاپ کا حکم دیا۔ اس نے پستول کی نوک گھر کے ایک مرد کی کینٹی پر رکھ کر حکم دیا کہ اسے کیمپ میں پہنچا دیا جائے۔ اس ”بہادر میجر“ کے کیمپ تک پہنچانے کا واقعہ اس گھر کے افراد نے مزے لے لے کر مجھے سنایا۔ فوجی کمک لے کر آنے والی گاڑیوں میں سے ایک کا ڈرائیور ہماری فائرنگ سے اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے گاڑی بجلی کے کھمبے سے ٹکرا دی۔ اس حادثے میں ایک افسر اور فوجی شدید زخمی ہو گئے۔

اس کامیاب معرکے نے ہمیں خوشی کا بہت سا سامان دیا۔ اس کے بعد گاؤں سے ہم نکلے۔ آدھی رات کے وقت لار کیمپ سے گزرنے لگے تو دیکھا ابھی تک فائرنگ ہو رہی ہے۔ پہلے تو ہم نے سمجھا شاید کوئی باقاعدہ جنگ ہے۔ لیکن بعد میں غور کرنے پر معلوم ہوا کہ ہوائی فائرنگ کی جا رہی ہے۔ دراصل وہ ہمیں اپنے سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ان سے لڑنے کا ہمارا بھی کوئی پروگرام نہ تھا۔ کیمپ کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم منی گام کی جانب چلے گئے۔ ہمارے جانے کے بعد اس گاؤں کا نام لوگوں نے ”شاہین پکٹ“ رکھ دیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ہم اس کے بعد اس گاؤں میں کبھی نہیں جاسکے، البتہ اس گاؤں کے افراد سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بھارتی فوج نے بھی اس گاؤں میں جانے کی جرات نہیں کی، وہ کہتے تھے اس گاؤں میں افغانی رہتے ہیں۔

ست پال کا انجام

منی گام اور کنگن کے علاقوں میں ہم نے ایک ماہ گھوم پھر کر گزارا۔ مقامی لوگوں سے ملتے اور ان کی محبتیں وصول کرتے رہے۔ ایک دن منی گام کے پہاڑ پر ہم سب بیٹھے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے، سب ساتھیوں نے اپنی گتیں کھول رکھی تھیں۔ گنوں کی صفائی ہو رہی تھی اور تیل دینے کا کام جاری تھا۔ ایک ساتھی نے باتوں باتوں میں کہا۔۔۔۔۔ ست پال کو واپس آئے ہوئے بھی بہت دن گزر چکے ہیں اور اس نے ظلم و ستم کا سلسلہ ایک بار پھر زور و شور سے شروع کر دیا ہے۔ ہمیں اسے ٹھکانے لگانے کا کام پہلی فرصت میں سرانجام دے دینا چاہیے۔

وائرلیس کے ذریعے بھی ہمیں ست پال کے تازہ کرتوتوں کی اطلاعات مل چکی تھیں۔ منی گام کے پہاڑ پر ہم نے ایک پناہ گاہ بنالی تھی۔ ہمیں عارضی قیام کے لیے بھی اس کی ضرورت تھی اور اگر ست پال کے قتل میں ہم کامیاب ہو جاتے تو بھی ہمیں اس پناہ گاہ کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ کیوں کہ اس صورت میں ہمارے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائی متوقع تھی۔ ایک بار پھر ہمارے دن رات ست پال کی تلاش کے بارے میں سوچ و فکر میں گزرنے لگے۔ ایک دن میں نے وائرلیس

آن کیا تو دوسری طرف ست پال ہی کے فوجی مصروف گفتگو تھے۔ میں نے ان کی گفتگو میں مداخلت کی اور کہا۔۔۔۔۔ ”ہم ست پال ہی کو جہنم کی راہ دکھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ چند دنوں تک ہم تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں۔“ وائرلیس پر بات کرنے والے نے ہماری دھمکی کو مذاق سمجھا۔ پہلے ہنسا اور پھر ہمیں دھمکیاں دینے لگا۔ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”ست پال سے کہہ دینا اس کی زندگی کے چند دن باقی رہ گئے ہیں۔ پھر نہ کہنا پہلے بتایا نہ تھا۔“

دسمبر ۱۹۹۳ء ختم ہونے کو تھا۔ یہ شدید سردی کا موسم تھا اور ہم پہاڑ کی بلندی پر تھے۔ ان دنوں میں نقل و حرکت مشکل تھی۔ برف کی سفید گہری چادر نے منی گام کے پہاڑوں کو لپیٹ رکھا تھا۔ ایک شام کھانا کھانے کے بعد میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ ہمارا پروگرام ست پال کو ٹھکانے لگانا تھا۔ بلند و بالا پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا انتہائی کٹھن تھا۔ راستے میں برف پڑنے لگی۔ رات کے گہرے اندھیرے میں برف باری نے سفر کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ گرتے پڑتے رات کے تیسرے پہر ہم نیچے ایک گاؤں میں پہنچے۔ صبح ایک گھر میں ناشتا کیا تو جان میں جان آئی۔ چند ساتھی وہاں رک گئے اور میں نے تین دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ طلوع آفتاب کے ساتھ گاندربل کا رخ کیا۔ شام ڈھلے ہم ایک گاؤں میں داخل ہوئے اور وہاں ایک پناہ گاہ میں قیام کیا۔ اگلا دن پھر چلتے رہے۔ اگلے گاؤں میں ڈسٹرکٹ کمانڈر شاہد الاسلام سے ملاقات کی۔ ان سے اپنے پروگرام کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ چند دن تک ہم وارسو، واکپورہ، وٹ پورہ اور کرہامہ کے گاؤں میں اس ظالم شخص کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ جہاں بھی جاتے لوگ یہی کہتے ”وہ ادھر سے گزرا ہے۔ ادھر سے گزرا ہے۔“ عجیب اتفاق تھا جہاں بھی ہم پہنچتے پتہ چلتا کہ ہمارا شکار ایک گھنٹے قبل اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے جا چکا

ہے۔ وہ عام طور پر ٹیکسی یا کسی دوسری عام گاڑی میں سفر کرتا تھا۔ اس لیے اس کا پتا چلانا مشکل تھا۔ بار بار وہ روپ بھی تبدیل کر لیتا۔ ایک دن ہمیں خبر ملی کہ وہ فلاں گاؤں میں آئے گا۔ ہم نے گاؤں جانے والی سڑک پر گھات لگائی۔ بد قسمتی سے سست پال کو بھی کسی مخبر نے ہمارے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ وہ راستے میں ہی گاڑی سے اتر گیا اور ایک جلے ہوئے پل کو عبور کر کے نالے کی دوسری طرف چلا گیا، جہاں اس نے وائرلیس سیٹ پر دوسری گاڑی منگوائی اور جان بچا کر بھاگ گیا۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہ آیا، اس دوران ہمیں اطلاع مل گئی کہ وہ فرار ہو گیا ہے۔ مایوس ہو کر ہم بھی وہاں سے نکل آئے۔

ایک دن ہم ناشتہ کرنے کے بعد حسب معمول سست پال کی تلاش میں نکلے تو سست پال سے اچانک ”ملاقات“ ہو گئی۔۔۔۔۔ لیکن اس موقع پر ہماری پوزیشن دفاعی تھی، اس لیے وہ پھر بیچ نکلا۔ اس روز ہم وار سو سے زیارت بابا صالح جا رہے تھے۔ بابا صالح کی زیارت کے قریب ایک پہاڑ کے دامن میں چشمہ ہے جہاں ہم وقتاً فوقتاً بیٹھا کرتے تھے۔ یہ جگہ ہمارے لیے خاصی محفوظ تھی اور یہاں ہمیں سست پال کی نقل و حرکت کی اطلاعات بھی پہنچتی رہتی تھیں۔ ہم اس وقت چھ مجاہد تھے۔ میرے پاس حسب معمول پیکاگن تھی جب کہ دوسرے کلاشن کوفوں سے مسلح تھے۔ ہم بازار کے عین درمیان میں پہنچے تو سامنے سے فوجی گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ تین ساتھی کافی آگے چل رہے تھے جبکہ دو میرے پیچھے تھے۔ اگلے تین ساتھیوں نے جوں ہی فوجی گاڑیاں دیکھیں، وہ دکانوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی گلی میں غائب ہو گئے۔ پیچھے والے ساتھی بھی ایک دکان کے عقب میں غائب ہو گئے، مگر میری پوزیشن ایسی تھی کہ چھپنے کی کوئی جگہ مجھے نہ ملی۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ ضرورت پڑی تو لڑوں گا۔ فی الفور میں نے گن کی سیفٹی اتار لی۔ سڑک

بہت تنگ تھی۔ میں پیکا گن تان کرایک دکان کے دروازے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک جیپ میرے قریب سے بڑی تیزی سے گزر گئی۔ میں نے دیکھا ست پال اس کی اگلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک ثانیسے کے لیے میری اور اس کی نظریں آپس میں ٹکرائیں، خوف کی ایک لہر اس کے چہرے پر آئی اور گزر گئی۔ اس کے معاً بعد اسی تیزی سے ایک ون ٹن ٹرک گزرا، جس پر ایک فوجی ایل ایم جی لیے کھڑا تھا اور دس بارہ فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک شکتی مان گاڑی بھی گزر گئی۔ فوجی میری گن دیکھ کر بری طرف خوف زدہ ہو گئے تھے، پھر بھی مجھے توقع تھی کہ وہ آگے جا کر واپس میری طرف پلٹ کر آئیں گے۔ میں چند منٹ تک وہیں کھڑا ان کا انتظار کرتا رہا، لیکن وہ نہیں آئے۔ خوف زدہ لوگ دکانوں سے آہستہ آہستہ باہر نکلنے لگے اور میری جان بچ جانے پر مجھے مبارکبادیں دینے لگے۔ چند منٹ بعد میرے دوسرے ساتھی بھی میرے پاس پہنچ گئے۔ میں نے جب انہیں ست پال کے بارے میں بتایا، تو باہمی مشاورت کے بعد اس کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک کلومیٹر مزید چلنے کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں گاندربل اور لار جانے والی سڑکیں آپس میں ملتی ہیں۔ وہاں ایک اونچی جگہ پر چنار کے درختوں کا جھنڈ ہے۔ میں نے ساتھیوں کو ساتھ لے کر اس مقام پر گھات لگانے کا انتظام کیا۔ اس دوران لار کیمپ سے چار گاڑیاں نکلتی دکھائی دیں اور ان کا رخ اس جانب تھا، جدھر ست پال گیا تھا۔ شاید اس نے خوف زدہ ہو کر کمک منگوائی تھی۔ ہم نے کافی دیر اس مقام پر انتظار کیا لیکن ست پال کی چھٹی حس نے اسے خطرے سے خبردار کر دیا تھا، وہ نہیں آیا۔ مجبوراً وہاں سے نکل کر ہم پھر زیارت بابا صالح پر چلے گئے۔ یہ اونچی جگہ تھی اس لیے ہمیں نیچے کے علاقے میں فوجیوں کی نقل و حرکت اچھی

طرح نظر آسکتی تھی۔ کچھ دیر بعد اطلاع ملی کہ ست پال ایک بار پھر گاڑی سے اتر کر پل عبور کر کے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر کیمپ میں جا چکا ہے۔ باقی گاڑیاں اس نے واپس بھیج دی تھیں۔ ان گاڑیوں پر بیٹھے ہوئے فوجی ہماری موجودگی سے اتنے خوف زدہ تھے کہ انہوں نے وار سو کے قریب گاڑیاں خالی کر دیں اور آگے پیدل روانہ ہو گئے تاکہ ہمارے حملے کی صورت میں ادھر ادھر چھپنے یا بھاگنے کا موقع مل سکے۔ ان کو نشانہ بنانے کا میرا موڈ بن رہا تھا، اس لیے کہ وہ بھی ست پال کے ساتھی تھے، لیکن ساتھیوں کا اصرار تھا کہ انہیں نہ چھیڑا جائے۔ پھر بھی میں ضبط نہ کر سکا اور میں نے ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔

”او بزدل فوجیو! ہمت ہے تو ادھر آؤ....“

فوجی واقعی بزدل تھے۔ میری آواز سنتے ہی انہوں نے بھاگنا شروع کر دیا اور جلد ہی ہماری نظروں سے او جھل ہو گئے۔

پندرہ دن مزید گزر گئے، ست پال ہمیں نہ ملا۔ البتہ مسلسل اس کے تعاقب میں رہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی نقل و حرکت سے مکمل آگاہی ہو گئی۔ اس کے معمولات نشست و برخاست اور سونے جاگنے کے اوقات تک کا ہمیں علم ہو گیا۔ میں نے اس عرصے میں منی گام سے اپنے ان چار پاکستانی ساتھیوں کو بھی بلا لیا جو وہاں رک گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے دو گروپ بنا لیے۔ ہر گروپ میں چار، چار پاکستانی مجاہد رکھے اور دونوں گروپوں میں چند کشمیری مجاہد بھی شامل کیے۔ ایک روز میں نے ست پال کے بارے میں سنا کہ وہ گاندر بل کے قریب ایک مقام سے گزرے گا۔ میں نے ایک گروپ کو وہاں گھات لگانے بھیجا۔ سارا دن وہ ست پال کا انتظار کرتے رہے، لیکن وہ وہاں سے نہ گزرا۔ اس کے بعد چند دن تک ہمارے دونوں گروپ سڑک کے آس پاس مختلف مقامات پر گھات لگاتے رہے، لیکن ست

پال کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

۱۳ جنوری ۱۹۹۳ء کی شام کو بالا خروہ فیصلہ کن گھڑی آگئی جس کا ہمیں کوئی ایک ماہ سے انتظار تھا۔ سیٹ پر مجھے کال کیا جا رہا تھا۔ سیٹ اٹھایا تو دوسری طرف ہماری انٹیلی جنس کا ایک مجاہد تھا۔ اس نے کہا کہ ست پال ابھی ابھی ایک میٹا ڈار گاڑی میں دس دوسرے فوجیوں کے ہمراہ روانہ ہوا ہے اور وہ فلاں جگہ پر چھاپہ مارے گا۔ ہمارے ساتھی نے گاڑی کا نمبر نوٹ کرایا اور روانگی کا وقت بھی بتا دیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ قریب ہی ایک مقام پر پہنچ کر ست پال کا انتظار کیا جائے۔ ہم فوراً تیار ہوئے اور دوڑتے ہوئے مجوزہ مقام پر پہنچے۔ وہاں ہم نے اپنے چھپنے کا بندوبست کیا۔ اس جگہ سڑک سیدھی تھی۔ اس جگہ کو اس لیے چنا گیا کہ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی اور گاڑی یہاں آہستہ چلنے پر مجبور تھی۔ اس کے قریب ہی بھارتی فوج کا ایک کیمپ اور ایک مندر بھی تھا۔ پاکستانی مجاہدین کے علاوہ ایک کشمیری مجاہد جمیل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس وقت شدید سردی تھی مگر ست پال کے انتظار میں ہماری بے چینی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس لیے ہم موسمی ماحول سے بے نیاز تھے۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا اور آسمان پر تارے ٹمٹارہے تھے۔ ہم پوری طرح چوکے تھے اور ہماری انگلیاں گنوں کے ٹرائیگرز پر تھیں۔

سیٹ کے ذریعے ہمارا رابطہ اپنے دوستوں سے قائم نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے ست پال کی واپسی کی خبر ابھی تک نہیں ملی تھی۔ ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ ست پال ایک مجاہد کے گھر چھاپہ مارنے گیا ہوا ہے۔ ہمیں یہ اطمینان ضرور تھا کہ ست پال گزرے گا اسی راستے سے، کیونکہ کیمپ کو جانے کے لیے اور کوئی سڑک نہیں تھی۔ ایک مسئلہ اندھیرے میں گاڑیوں کی پہچان کا بھی تھا۔ سڑک سے عام گاڑیاں بھی گزر رہی تھیں، اس لیے یہ معلوم کرنے کے لیے ست پال کس گاڑی میں ہے

ہم نے جمیل کو کلاشن کوف دے کر سڑک پر کھڑا کر دیا۔ اس کو ہدایت دی کہ ہر گاڑی کو روک کر اس میں دیکھے کہ ست پال اور اس کے ساتھی موجود ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ ہم ست پال کو اس بار کھونا نہیں چاہتے تھے۔

سات بجے کے قریب ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ جوں ہی وہ ہمارے قریب پہنچی، جمیل نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ اس نے اندر جھانکا تو اسے گتیں نظر آئیں۔ یہ ست پال ہی کی گاڑی تھی۔ ست پال فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے جوں ہی جمیل کی کلاشن کوف کو دیکھا، ڈرائیور سے کہا۔۔۔۔۔ ”گاڑی روکو تاکہ اس اگر وادی کو سبق سکھایا جائے۔“ جمیل کی آواز فضا میں گونجی ”یہی ہے۔۔۔۔۔ یہی ہے۔“ اور اس کے ساتھ ہی جمیل نے گاڑی کے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور سڑک پر لیٹ گیا۔ ان چند لمحوں کے اندر اندر گاڑی کا کنڈیکٹر بھی صورت حال کی سنگینی سمجھ گیا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ہم سے دوسری طرف گاڑی کے ٹائر کے قریب لیٹ گیا۔

جمیل کی آواز سنتے ہی ہماری گتوں نے شعلے اگلنے شروع کر دیے۔ ہم گاڑی سے محض بیس میٹر کے فاصلے پر تھے۔ دو منٹ کے اندر اندر ہم نے ست پال سمیت سارے فوجیوں کو بھون ڈالا۔ اندر سے فوجیوں کو صرف دو فائر کرنے کی مہلت مل سکی، وہ بھی ہوائی تھے۔ گاڑی سے چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ ہم نے کارروائی مکمل کی اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک گاڑی میں بیٹھے اور وارسو پہنچے۔ وہاں سے ہم راتوں رات لار چلے گئے۔ اس کارروائی میں گاڑی کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر بچ گئے۔ ڈرائیور کی ٹانگوں میں گولیاں لگی تھیں۔ بعد میں ہم نے اس سے مل کر معذرت کی۔ اس کا حوصلہ قابل رشک تھا۔ وہ بھی ست پال کے مرنے پر بڑا خوش تھا۔

کشمیری عوام کو ست پال کے ظلم سے نجات دلا کر بے پناہ خوشی ہوئی۔ آج بھی اس کے بارے میں سوچوں تو آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔

اسی طرح ہم نے آٹھ دس روز گزار دیے۔ ایک روز ساتھیوں نے کہا۔۔۔۔۔

”ست پال کو واصل جہنم ہوئے کافی دن گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد سے ہم بے کار

بیٹھے ہو رہے ہیں، کچھ ”کام“ تلاش کرنا چاہیے۔“ کافی دیر تک اس موضوع پر گرم گرم بحث کے بعد ایک کارروائی کرنے کے منصوبے کو حتمی شکل دی گئی۔

سری نگر لداخ روڈ اس علاقے کی بڑی شاہراہ ہے۔ دن بھر بھارتی فوجی گاڑیاں سری نگر اور لداخ کے درمیان محو سفر رہتی ہیں۔ اسی علاقے میں کنگن سے چودہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہم ایک کارروائی پہلے بھی کامیابی سے کر چکے تھے، ہم اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ اسی مقام پر دشمن کو نشانہ بنایا جائے۔ پورا پروگرام طے کرنے کے بعد اس علاقے کی ریکی کی گئی۔

معلوم ہوا ہر روز سہ پہر کے وقت ایک فوجی کاتوائے یہاں سے گزرتا ہے۔ ہم نے اسی فوجی قافلے پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ایک روز اس کے بارے میں لوگوں سے ابتدائی معلومات لینے کے بعد میں اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ گیا۔ عصر کے وقت جب سورج کنگن کے بلند و بالا پہاڑوں پر ڈھلنے لگا تھا، ہم نے اسلحے کو چھپانے اور ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے فرنیس اور گرم کوٹ پہن لیے۔ ہم پانچ تھے۔ میرے کندھے پر میری پیکاگن تھی۔ دوسرے ساتھی کلاشن کوفوں سے مسلح تھے۔ سڑک پر اترنے کے بعد ہم فی الفور طے شدہ پوزیشنوں پر چلے گئے۔ اس دفعہ بھی ہماری کارروائی کا مقام کم و بیش وہی تھا، جہاں ہم نے کنگن کی پہلی کارروائی کی تھی۔

تین ساتھیوں کو میں نے کورنگ پر رکھا اور حملے کے لیے صرف ایک ساتھی کو اپنے ساتھ رکھا۔ ہائی وے سے کچھ دور نالہ سندھ بہتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ گزشتہ حملے کی وجہ سے اب ہر کلومیٹر کے بعد فوج نے ایک حفاظتی چوکی بنادی تھی، جہاں ہر وقت فوجی پہرے پر موجود رہتے تھے۔ ہم سے چند سو میٹر کے فاصلے پر ایک پوسٹ مشرق میں اور دوسری مغرب میں تھی۔ ہمیں ان

دو تلوں چوکیوں پر متعین فوجیوں کا خیال رکھنا تھا۔ اس لیے ہم نے اس بات کا پورا اہتمام کیا تھا کہ کوئی ہمیں گھات کے مقام پر جاتے ہوئے نہ دیکھ پائے۔ پانچ بجے کے قریب بھارتی فوج کی تین گاڑیاں سڑک کے موڑ سے ایک بڑے مکان کے پہلو سے نمودار ہوئیں۔ ہم نے انہیں گزرنے دیا۔ یہ چھوٹی گاڑیاں تھیں۔ ہم ”چھوٹے شکار“ کے موڑ میں نہ تھے۔ ان کے پیچھے تین شکتی مان گاڑیاں آرہی تھیں، ہم نے ان ہی کو نشانہ بنانا تھا۔ جوں ہی پہلی گاڑی میری ریخ میں آئی، میں نے پیکا سے اس کے عقب میں مشن گن تھامے ہوئے فوجی پر فائر کر کے اسے ڈھیر کر دیا۔ دوسرے ساتھی نے دوسری گاڑی پر فائرنگ کر دی۔ گاڑیوں نے رکے بغیر جوابی فائرنگ کی۔ لیکن انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انہیں تاک تاک کر گولیاں مارنے والے کہاں ہیں۔۔۔؟ وہ زیادہ تر فائرنگ جنگل کی جانب کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد قریبی پوسٹوں سے بھی فائرنگ ہونے لگی۔ ہمیں اپنے اسلحے کے محدود ہونے کا احساس تھا، اسی لیے میں فوجیوں کے سروں کا نشانہ لے کر فائر کر رہا تھا۔ محض بارہ فائر کر کے میں نے فائرنگ روک دی، اس لیے کہ فوجی گاڑیاں اب ہماری ریخ سے دور جا چکی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سیٹی بجائی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر جنگل کی طرف چڑھنے لگا۔ بھارتی فوجی اب بھی زور و شور سے فائرنگ کر رہے تھے، تاہم ان کا ہدف اب بھی جنگل کا وہ حصہ تھا جو ہم سے دور تھا۔ ہم ان کی گولیوں سے محفوظ بڑے سکون سے اوپر چڑھتے ہوئے ایک گھنٹے بعد جنگل میں اپنے ہائیڈ آؤٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں جا کر نماز پڑھی، کھانا تیار کر کے کھایا اور پھر لمبی تان کر سو گئے۔

اگلے دن ہم اپنے ہائیڈ آؤٹ پر آرام کر رہے تھے کہ مقامی آبادی کا ہمارا ایک میزبان ہمارے پاس آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ روز کے حملے میں چھ بھارتی

فوجی مارے گئے اور اتنے ہی شدید زخمی ہوئے تھے۔

پھاڑوں پر نشیمن

اس علاقے میں ہمیں اب ایک مستقل خفیہ ٹھکانے (Hide Out) کی ضرورت تھی۔ میں نے ساتھیوں سے کہا، ”کیوں نہ ایک خفیہ ٹھکانہ تعمیر کر لیا جائے، تاکہ ہمیں لوگوں کے گھروں میں جانا ہی نہ پڑے۔“ چار ساتھیوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ان کا موقف تھا سردی کے ایام آبادی میں ہمدردوں کے گھروں میں مقامی مجاہدین کی طرح رہ کر گزارنا مناسب ہو گا۔ جبکہ ہم چار اپنا ٹھکانہ بنانے کے حق میں تھے۔ میرے علاوہ اسد اللہ، حمزہ سنگریا اور عبدالرحمان مقامی آبادی میں راتیں بسر کرنے کے خطرے سے بچنے کے حق میں تھے، تاکہ ہمارے میزبان ایکسپوز ہو کر فوجی مظالم کا نشانہ نہ بنیں۔

بحث میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو طے کیا کہ اپنے اپنے پسندیدہ طریقے کو اپنایا جائے۔ میں اپنے ساتھیوں اور چند مقامی مجاہدین کے ہمراہ ہائیڈ آؤٹ کے لیے کسی موزوں جگہ کی تلاش میں نکل پڑا۔ ہم پھاڑ کو عبور کر کے دوسری طرف پہنچے۔ بہت بلندی پر ایک مقام نہایت موزوں معلوم ہوا۔ فوج کا ادھر گزر کم ہی ہوتا تھا۔ قریب ہی ایک چشمے سے پانی ابل رہا تھا۔ مقامی مجاہدین نے بھی میری پسند پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ راشن وغیرہ لانے کا راستہ بھی تھا۔ دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ موزوں

تھی۔ اس کے ارد گرد بارودی سرنگیں بچھا کر دشمن کو روکا جا سکتا تھا۔ اگر فوج عقب کی جانب سے آنے کی کوشش کرتی تو محفوظ علاقے کی طرف نکل جانے کے امکانات بھی تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ عقب کی جانب سے ہمارے پاس پہنچنے میں دشمن کو کم از کم تین دن کا پیدل سفر طے کرنا پڑتا تھا۔

خوش قسمتی سے اس مقام پر جو تقریباً دس ہزار فٹ بلند ہے، ہمیں ایک غار مل گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ اسی کو پناہ گاہ میں بدل دیا جائے۔ مقامی ساتھی گینتی پیچھے لے آئے۔ میں ٹارچ لے کر غار میں داخل ہوا، جو کافی بڑا تھا۔ اندر جنگلی جانوروں کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ غار کی خوف ناک تاریکی اور ہڈیاں دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آئی، لیکن جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس کے بعد ہڈیاں اٹھا کر باہر پھینکیں اور باہر سے مٹی اندر ڈالی۔ کافی دیر تک صفائی، کھدائی اور مٹی ڈالتے رہنے کے بعد ہم غار کی سطح کو ہموار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب اس ”کمرے“ میں منتقل ہونے کا مرحلہ تھا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ٹارچ کے ذریعے غار کا تفصیلی معائنہ کیا تو ایک کونے میں نیچے کی طرف ایک بڑا سوراخ نظر آیا۔ قریب گیا تو معلوم ہوا اس غار کے نیچے ایک اور غار ہے۔ ٹارچ کے ذریعے اوپر سے دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی تو اسد اللہ بھائی سے مدد لی۔ ڈر تھا آگے کوئی درندہ نہ ہو۔ میں نے پستول نکالا اور دوسرے ہاتھ میں ٹارچ لے لی، اسد اللہ بھائی نے میری ٹانگیں پکڑی ہوئی تھیں اور میں الٹا ہو کر غار میں لٹک گیا۔ کچھ دیر بعد ہاتھوں کی انگلیاں زمین سے ٹکرائیں اس سے غار کی گہرائی کا اندازہ ہو گیا۔ میری توقع کے برعکس غار میں کوئی درندہ نہ تھا۔ چند لمحوں اسی طرح لٹکے ہوئے ٹارچ کی مدد سے جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد اسد اللہ بھائی نے میرے کہنے پر مجھے دوبارہ اوپر کھینچ لیا۔ چند منٹ تک سانس درست کرنے کے بعد دوبارہ سیدھا ہو کر سوراخ کے راستے

نیچے اترا۔ یہ غار بالائی غار سے زیادہ بڑا تھا۔ اندرونی ساخت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں نے دوسرے ساتھیوں کو بھی نیچے بلا لیا۔ سب نے اس نئی جگہ کو پسند کیا، یہ جگہ زیادہ محفوظ اور گرم تھی۔ غار سے باہر جانے کا راستہ بھی دریافت ہو گیا۔ ایک کونے میں ایک دراڑ تھی جسے کھود کر ہم نے اچھی خاصی گزر گاہ بنالی۔ اس کے بعد مٹی کھودنے اور ڈھونڈنے کا کام از سر نو شروع کیا گیا۔ کافی تک و دو کے بعد یہ غار اچھے خاصے کمرے کی شکل اختیار کر گیا، جہاں دس افراد آسانی سے قیام کر سکتے تھے۔

اگلے روز ہمارے مقامی ساتھی سامان سے لدے چھ گھوڑوں کے ہمراہ آ پہنچے۔ اس سامان میں کمبل، بستر، آگ جلانے کی بخاری، برتن، تیل، گیس کے چولہے اور روزمرہ استعمال کی دوسری اشیاء تھیں۔ سب ساتھیوں نے مل کر ان اشیاء کو پناہ گاہ میں سجایا۔ غار کو آراستہ کرنے کے بعد قریبی چشمے سے ایک پائپ کے ذریعے ہم نے کمرے میں پانی لانے کا بندوبست بھی کر لیا۔ لکڑی کے مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے جوڑ کر غار کا دروازہ بھی بنا لیا گیا جو سرشام بند کر دیا جاتا تھا۔ ایک بلند و بالا پہاڑ پر، دنیا سے بالکل الگ تھلگ، دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں صفر سے کئی درجے نیچے ٹمپریچر میں ہم اکثر وقت کمبلوں میں لیٹے رہتے تھے۔ یہی جگہ مسجد تھی اور یہی خواب گاہ بھی۔ یہاں ہمارے یادگار دن گزرے۔

نئی قیام گاہ میں ہم نے بہت سے خطروں سے کنارہ حاصل کر لیا، لیکن ایک رات ایک خوف ناک آواز نے مجھے جگا دیا۔ ٹارچ اور پستول سنبھال کر میں نے کان لگا کر دوبارہ آواز سننے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ وہی آواز غار کی ”بالائی منزل“ سے سنائی دی۔ میں نے بیجوں کے بل سوراخ سے اوپر ٹارچ لگا کر دیکھا تو مجھے دو ٹارچیں روشن نظر آئیں۔ دل میں پہلا خیال آیا کہ بھارتی فوجی آ پہنچے، لیکن

جلد ہی اس خیال کو جھٹک کر خود سے کہا۔۔۔ ”بزدل فوجی اس وقت یہاں آنے کی جرات نہیں کر سکتے۔“ چند لمحے بعد دھاڑنے کی آواز نے معاملہ صاف کر دیا۔ وہ کوئی شیر تھا۔۔۔ شاید اس رہائش گاہ کا اصل مالک۔ ہم واضح طور پر مداخلت بے جا کے مرتکب ہوئے تھے۔ دل میں کچھ ندامت کا احساس پیدا ہوا، لیکن شیر کی طرف سے مزید اقدام کے بغیر کسی رد عمل کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ شیر چند لمحے تک ٹارچ کی روشنی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ہمارے آرام میں مداخلت پر معذرت کا تاثر دیتے ہوئے رخصت ہو گیا۔ حالانکہ معذرت خواہ ہم تھے جنہوں نے اس کے گھر پر ”غاصبانہ“ قبضہ جمار کھا تھا۔ مگر شیر نے سچ مچ شیر ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ مہمان نوازی اور اعلیٰ ظرفی میں ہم انسانوں پر بازی لے گیا۔ اس کے بعد پھر شیر کبھی ادھر نہیں آیا۔

ہائیڈ آؤٹ کے قریب ہی ہم نے لکڑی کے تختوں سے ایک چھوٹی سی جگہ بھی بنالی تھی، جہاں دھوپ بھی سینک لیتے تھے۔ کوئی ایک ماہ تک ہم یہاں قیام پذیر رہے۔ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ بلندی کی وجہ سے یہاں چاروں طرف نہایت گہری برف موجود تھی، کچھ دن بعد مزید برف گرنے لگی تو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہم دنیا سے بالکل کٹ کے نہ رہ جائیں۔ اس خطرے نے ہم سے یہ مامن چھڑا دیا۔ ہم نے اپنی گتیں اور ایمونیشن اٹھایا، دیگر اشیاء کو وہیں محفوظ طریقے سے چھوڑا اور اپنی پناہ گاہ کو اچھی طرح بند کر کے کنگن روانہ ہو گئے۔ کنگن میں چند دن گزار کر گاندر بل چلے گئے۔

ایک رات گاندر بل کے علاقے بن ہامہ میں اپنے ایک ہمدرد کے ہاں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے جگادیا۔ گن اور ٹارچ سنبھال کر جلدی سے اٹھا، اذاتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ باہر نکلا تو ایک مقامی مجاہد

دوڑتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس سے ماجرا پوچھا؟ اس نے بتایا۔۔۔ ”قریبی بستی لار میں اٹک کے عبداللہ بھائی اور مقامی ساتھی فیاض احمد عرف طوطا اور طاہر ایک مکان میں سوئے ہوئے تھے کہ فوج نے مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ طاہر نے تو مکان کی دوسری منزل سے چھلانگ لگائی اور فوج کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے فرار ہو گیا جبکہ دوسروں کے ساتھ جھڑپ جاری ہے۔“ مزید تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ محاصرہ بی ایس ایف نے کیا ہے اور اس کی قیادت ست پال کے نائب میجر مینا کے ہاتھ میں ہے۔ یہ شخص بھی بلا درجے کا ظالم تھا۔ بہت سے مجاہد اور بے گناہ شہری اس کے ظلم و تشدد کا شکار ہو چکے تھے۔ مجبر نے اسے دوسری منزل پر بنی ہوئی ہائیڈ آؤٹ دکھا کر بتایا تھا، عبداللہ بھائی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ مجبر نے بالکل ٹھیک نشاندہی کی تھی، لیکن ست پال کے جانشین کو اس کی قضا نے دعوت دی تھی۔ عبداللہ بھائی اپنی کلاشن کوف کے ٹرائیگر پر انگلی چپکائے آنے والے کے ”استقبال“ کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ جوں ہی مینا اوپر چڑھا عبداللہ بھائی نے درجنوں گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ مینا گر پڑا۔ اپنے افسر کو مرتے دیکھ کر باقی ”بہادر“ فوجی بھاگ کر ساتھ والے مکانوں میں جا کر چھپ گئے۔ تاہم عبداللہ بھائی اور ان کے ساتھیوں کے لیے محاصرہ توڑنا ممکن نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد طاہر بھائی فوج کا محاصرہ توڑتے ہوئے ڈیڑھ کلومیٹر دور بن ہامہ میں ہم سے آ ملے۔ ان سے کچھ مزید تفصیل معلوم ہوئیں۔ ان کی دائیں ہاتھ کی ایک انگلی گولی لگنے سے زخمی ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ اس وقت کشمیر کے چار مجاہد تھے۔ پاکستانی ساتھی کنگن میں تھے جب کہ عبداللہ بھائی جو مجھ سے کچھ وقت کے لیے الگ ہوئے تھے گھیرے میں پھنس چکے تھے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا ہمیں فوراً جا کر فوج پر حملہ کر کے گھیرا توڑنا اور ساتھیوں کو نکالنا ہے۔

ہم پانچوں ساتھی ایک مختصر راستے سے تقریباً دوڑتے ہوئے لار پہنچے۔ فوج ابھی تک فائرنگ کر رہی تھی، مگر انہوں نے جوں ہی ہمیں دیکھا ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ فوج مکانوں کو نشانہ بنا کر فائر کر رہی تھی۔ ہم ان فوجیوں کے عقب سے آرہے تھے۔ فوج نے بھاگنا شروع کیا تو میں نے ساتھیوں کو فائر کرنے سے منع کر دیا۔ اس دوران میں نے محسوس کر لیا تھا کہ گھروں کے اندر سے فائر نہیں آرہا۔ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ عبداللہ بھائی اندر ہوتے اور خاموش رہتے یا مقابلے سے ہاتھ کھینچ لیتے۔ اب تو امکان یہی تھا کہ وہ شہید ہو گئے ہیں یا پھر نکل گئے ہیں۔

اپنے ساتھیوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہ پا کر میں نے دل ہی دل میں انا اللہ پڑھ کر اگلے اقدام کے بارے میں سوچ لیا۔ اپنے کشمیری ساتھیوں سے میں نے کہا۔۔۔ ”آج بدلہ ضرور چکایا جائے گا۔“ انہوں نے پوری مستعدی سے ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مجھے اندازہ تھا کہ فوجی یہاں کے معرکے سے فارغ ہو چکے ہیں، اس لیے وہ فوراً اپنی گاڑیوں کے ذریعے لار کیمپ کی جانب جائیں گے۔ میں ساتھیوں کے ہمراہ مار دھاڑ کرتا ہوا لار کیمپ سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر وٹ لار کے مقام پر جا پہنچا۔ مقامی ساتھیوں کو میں نے راستے میں مختلف مقامات پر پھرے پر تعینات کر دیا تھا۔ ان کی ذمہ داری یہ لگائی کہ پیدل فوج کو میری طرف نہ آنے دیں۔ وٹ لار کے قریب عین سڑک پر امام ابو حنیفہؒ کے نام پر ایک اسلامی درس گاہ ہے۔ جس کے قریب چند گھر ہیں۔ میں پیکا گن اٹھائے ہوئے جب اس مقام پر پہنچا تو مکانوں سے لوگ نکل کر باہر آ گئے۔ معرکے کے لیے یہی مقام موزوں تھا۔ دشمن قریب ہی تھا۔ اس سے آگے جانے کی صورت میں کوئی اوٹ نہ تھی اور پیچھے ہٹتے تو آبادی کے لوگ دونوں طرف سے فائرنگ کی زد میں آ جاتے۔ گھروں کے آگے چند گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بزرگ سے کہا،

ان گھوڑوں کو کہیں دور لے جا کر باندھ دیں اور گھروں کی خواتین اور بچوں کو بھی یہاں سے نکال کر پیچھے خاصے فاصلے پر لے جائیں۔

اس کے بعد میں نے سڑک کے بالکل ساتھ ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیا۔ جہاد کی راہ میں نکلیں تو اللہ تعالیٰ مرنے کا خوف ختم کر دیتا ہے۔ بعض اوقات تو انسان پر دیوانگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ مجاہد موت کا تعاقب کرتا ہے اور وہ آگے بھاگتی ہے۔ میرے دل میں کسی قسم کا خوف نہ تھا، بس دشمن کو پانے اور اس پر کاری ضرب لگانے کا جذبہ تھا۔ یہاں سے سڑک دور دور تک نظر آتی تھی۔ اب مجھے گاڑیوں کی آمد کا انتظار تھا۔ اس دوران وہی بزرگ دوبارہ آئے اور کہا.... ”بیٹا تم نے ناشتہ بھی نہیں کیا گھر میں ناشتا تیار ہے، پہلے کچھ کھاپی لو۔“ میں نے واقعی کچھ بھی نہیں کھایا تھا، لیکن یہ ناشتا کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے ان سے کہا آپ اصرار کرتے ہیں تو ایک کپ میں چائے ڈال کر پییں لے آئیں۔ اسی جگہ میں نے گن پر پوزیشن لیے ہوئے چائے پی کیونکہ دشمن پر حملہ کسی وقت بھی متوقع تھا۔ دریں اثنا میری وہاں موجودگی کی خبر چند گھروں سے نکل کر پورے محلے میں پھیل چکی تھی۔ کھڑکیوں، دروازوں اور چھتوں سے بہت سی شفقت و محبت سے جھانکتی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ بہت سے بچے، عورتیں اور بوڑھے اپنے اپنے گھروں کے دروازوں سے باہر نکلتے، مجھے دیکھتے اور پھر گھر کے اندر چلے جاتے۔ ان سب کے لبوں پر میری کامیابی اور سلامتی کی دعائیں تھیں۔ چند منٹ بعد ایک بزرگ ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے گھر سے نکلے اور تیزی سے میری طرف آئے۔ میں نے دور سے انہیں اشارہ کیا، سڑک چھوڑ کر واپس چلے جائیں، لیکن ان پر میرے اشاروں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں غصے سے تیج و تاب کھا رہا تھا، لیکن وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے برابر میری جانب بڑھتے رہے اور میرے غصے کو نظر انداز

کرتے ہوئے قریب آکر دودھ کا گلاس مجھے تھما دیا۔ ان کی سادگی اور خلوص نے میرے غصے کو ٹھنڈا کر دیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”اگر فوج آ جاتی تو آپ کی شہادت یقینی تھی۔“ انہوں نے کہا۔۔۔۔۔ ”اس سے بڑھ کر میرے لیے خوش بختی کیا ہو سکتی ہے۔“ میں نے جلدی سے دودھ حلق میں اندھیرا گلاس ان کے ہاتھ میں دیا اور انہیں واپس بھیج کر پھر گن سنبھال کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد ایک خاتون بالٹی میں دودھ لے کر دوڑتی ہوئی آگئیں۔ وہ بھی مجھے دودھ پلانے پر مصر تھیں، بمشکل میں نے ان کو منایا اور کہا۔۔۔۔۔ ”مزید دودھ پینے کی خواہش بالکل نہیں، فوج کے جانے کے بعد ضرور پی لوں گا۔“ آٹھ بجے کے لگ بھگ اچانک چند چھوٹے چھوٹے بچے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے بستے اٹھائے سکول جانے کے لیے سڑک پر نمودار ہوئے۔ انہیں دیکھ کر میں سخت پریشان ہو گیا۔ میں نے سوچا اگر اس دوران فوجی گاڑیاں آگئیں تو ان پر فائر کھولنا ممکن نہیں ہو گا۔ اللہ نے کیا یہ ”بلا“ بھی ٹل گئی۔ فوجیوں کو بھی آنے کی ابھی کوئی جلدی نہ تھی۔

دو گھنٹے تک بڑی بے چینی سے دشمن کا انتظار کرتا رہا۔ دس بجے کے قریب دو فوجی گاڑیاں نمودار ہوئیں۔ دونوں ٹرک تھے، ان پر درجنوں فوجی سوار تھے۔ یہ وہ گاڑیاں نہیں تھیں جن کا میں انتظار کر رہا تھا، بلکہ یہ دوسری طرف سے آرہے تھے۔ دراصل یہ کمک لار کی طرف جا رہی تھی لیکن مجھے کیا، میں تو فوجی گاڑیوں کا منتظر تھا، جس طرف سے بھی آئیں، میرے لیے یہی غنیمت تھیں۔ ایک ٹرک میرے سامنے سے گزرنے لگا تو میں اچانک اٹھا اور پیکا گن ساتھ لیے سڑک پر چھلانگ لگا دی اور دوسرے ٹرک کے سامنے والے شیشے پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھتے ہی بریک لگا دی تھی۔ آگے جانے والے ٹرک کے ڈرائیور نے فائرنگ کی آواز سنی تو اس نے بھی بوکھلاہٹ میں بریک لگا دی۔ فوجی

ایک دوسرے کے اوپر گر پڑے۔ اگلے ٹرک کا عقبی حصہ مجھ سے چند رہ میٹر کے فاصلے پر تھا اور پیچھے والا ٹرک بھی اتنا ہی دور تھا۔ میں ان دونوں ٹرکوں کے تقریباً درمیان میں تھا۔ وقت ضائع کیے بغیر میں نے آگے رکنے والے ٹرک کی پشت پر بیٹھے فوجیوں پر گولیوں کا برسٹ مارا۔ پیریکا کے برسٹ نے بہت سے فوجیوں کو خون میں نہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری پیریکا کا پٹہ ختم ہو گیا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پٹھو میں ہاتھ ڈالا، ایک گرینیڈ لیا، اس کی پن نکالی اور ٹرک کے اندر پھینک دیا۔ دھماکے کی زبردست آواز کے ساتھ ہی ”ہائے رام“ اور ”ہائے بھگوان“ کی صدائیں گونجنے لگیں۔ فوجیوں کے اوسان ایسے خطا ہوئے کہ وہ جوابی حملہ کرنے کی بجائے مدد کے لیے چیخ و پکار کرنے لگے۔

گرینیڈ پھینکنے سے مجھے چند لمحوں کی جو مہلت مل گئی اس میں پیریکا دوبارہ لوڈ کر لی۔ پھر میں تیزی سے پچھلے ٹرک کے عقب میں پہنچ گیا۔ یہ شکتی مان گاڑی تھی جس کا پچھلا حصہ تقریباً پانچ فٹ بلند تھا۔ ٹرک ہی کی آڑ میں کھڑے ہو کر میں نے اندر دبکے ہوئے فوجیوں پر ایک برسٹ مارا۔ ایل ایم جی لیے ایک فوجی ٹرک پر کھڑا تھا۔ لیکن اس کے حواس گم ہو گئے تھے۔ میری پیریکا ایک مرتبہ پھر بند ہو گئی۔ دور جانا ممکن نہ تھا، اس لیے میں نے اسی گاڑی کے اگلے ٹائر کے پاس بیٹھ کر پیریکا کو دوبارہ لوڈ کیا۔ اس دوران اگلی گاڑی سے ایک زخمی فوجی باہر نکلا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر چل رہا تھا۔ اس نے جوں ہی مجھے دیکھا۔ ہاتھ کھڑے کر دیے اور روتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”بھگوان کے لیے مجھے کچھ نہ کہنا۔“ لیکن اس کی انگلی گن پر چپکی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اس سے مجھے ٹریننگ کے دوران پڑھا ہوا سبق یاد آ گیا کہ دشمن پر اعتبار نہ کرنا۔ اسے گرانے کے بعد میں نے گن پھر لوڈ کی اور نہایت اطمینان سے اگلے ٹرک کے پیچھے بچے کچھے فوجیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا۔ جس وقت میں پیریکا

لوڈ کر رہا تھا اگلی گاڑی کے ڈرائیور اور ایک فوجی کو گاڑی سے اتر کر بھاگ کر قریبی کھیتوں میں پناہ لینے کا موقع مل گیا۔ دو منٹ کے اندر اندر میں نے دونوں ٹرکوں پر اپنا حملہ مکمل کر لیا تھا۔

میری فائرنگ ابھی جاری تھی کہ پیچھے سے پانچ فوجی جیپیں ظاہر ہوئیں۔ ان جیپوں پر بھی فوجی سوار تھے۔ انہوں نے جب فائرنگ کی آواز سنی تو جیپیں روکیں اور بھاگ کر قریبی کھیتوں میں چھپنے لگے۔ میں نے درجنوں فوجیوں کو گنیں تھا، سر جھکائے کھیتوں میں چھلانگیں لگاتے دیکھا تو طبیعت ان کی خبر لینے کے لیے للچائی، لیکن یہ میرے منصوبے کے خلاف تھا۔ میرے پاس ایمنیشن بھی کم تھا اور پھر فوجی کھیتوں میں پوزیشنیں لے چکے تھے۔ یہاں کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا۔ اصل گاؤں یہاں سے تین سو میٹر کے فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر تھا۔ میں نے حملے سے پہلے ہی پسپائی کے لیے ایک راستہ دیکھ لیا تھا۔ فوجیوں کے کھیتوں میں پوزیشنیں لینے کے باوجود وہ راستہ ابھی تک محفوظ تھا۔ میں نے فوراً اپنی گن سنبھالی اور مدر سے کے عقب سے ہوتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں میں لوگوں پر جنگ کی دہشت سوار تھی۔ کم ہی کوئی باہر دکھائی دیا۔ راستہ بھٹک کر میں ایک گھر کے پاس پہنچا، آگے کانٹوں کی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے راستہ دریافت کیا تو اس نے کچھ چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ میں نے آنکھیں دکھائیں تو اس نے کانٹے اٹھا کر ایک طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”تم بھی میرے آگے چلو۔“ بار بار وہ کھسنے کی کوشش کرتا، لیکن میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ اس پر فوج کی دہشت کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ پچاس گز کا فاصلہ اس کے ساتھ مشکل سے طے کیا، پھر اسے چھوڑا اور ایک باغ میں داخل ہو گیا۔ میں درختوں کی اوٹ میں چلتا ہوا قریبی پہاڑ پر جانا چاہتا

تھا۔ باغ سے نکل کر ایک مکان کے پاس سے گزرا تو دیکھا کہ وہاں شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ جنگ کے ماحول میں یہ عجیب منظر تھا۔ بچوں نے مجھے دیکھا تو شور مچایا۔۔۔۔۔ ”شاہین بھائی۔۔۔۔۔ شاہین بھائی۔“

وہ سب میرے جاننے والے تھے۔ ان کے پاس رک کر پانی پیا۔ بہت تھک گیا تھا اس لیے اپنا پٹھو اور پیکا گن اتاری، گن کی سیفٹی چڑھا کر ایک تیرہ سالہ لڑکے کو دی، پٹھو ایک دوسرے شناسا لڑکے کو دیا اور کہا یہ سامان لے کر سامنے والے پہاڑ پر چڑھو، میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ میرے پاس اب دو رین اور پستول رہ گیا تھا۔ میں خاصا ”سبک دوش“ ہو کر آہستہ آہستہ پہاڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاؤں کی نکل پر ایک اونچی جگہ پر رک کر دو رین سے گرد و نواح کا جائزہ لیا۔ دونوں لڑکے پہاڑ پر کئی سو میٹر اوپر چڑھ رہے تھے۔ ان سے چند سو میٹر دائیں جانب وہ چار کشمیری ساتھی بھی پہاڑ کے اوپر چڑھتے دکھائی دیے، جن کو میں نے کورنگ کی ذمہ داری سونپی ہوئی تھی۔ ان کو میں پہلے ہی ہدایت دے چکا تھا کہ فائرنگ کے اختتام پر وہ سڑک کے کنارے بننے والے نالے سے ہوتے ہوئے پہاڑ کے اوپر چلے جائیں۔ نیچے دیکھا تو سڑک سے سو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی شہر کے ارد گرد کھیتوں کے درمیان گندم اور سرسوں کی فصل میں فوجیوں کے بے شمار سر نظر آرہے ہیں۔ وہ ابھی تک ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔

دشمن سے کامیابی سے نمٹنے کی وجہ سے آسودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی کامیابی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ کوئی دس منٹ تک وہاں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک سو میٹر مزید اوپر چڑھ کر دوبارہ دو رین کے ذریعے فوجیوں کی نقل و حرکت دیکھی۔ انہوں نے اب فائرنگ بند کر دی تھی۔ کچھ دیر کھیتوں میں دبکے رہنے کے بعد دو فوجی اٹھے اور گتیں تانے ان دو ٹرکوں کی طرف بڑھنے لگے، جن

کے دو کے سوا سارے فوجی میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ باقی فوجی انہیں کور دے رہے تھے۔ انہوں نے ٹرکوں تک سو میٹر کا فاصلہ کوئی آدھے گھنٹے میں رینگتے ہوئے طے کیا۔ جب یقین ہو گیا کہ حملہ آور چلے گئے ہیں، تو انہوں نے ڈرتے ڈرتے گاڑیوں کے اندر جھانک کر دیکھا، وہاں ان کے درجنوں ساتھی مرے پڑے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اشارے سے دو سرے فوجیوں کو بلایا۔ میں ان کی یہ ساری کارروائی بڑی دلچسپی سے دور بین سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد جیپوں نے حرکت کی۔ دو جیپیں لارکیمپ کی طرف چلی گئیں۔ دو جیپیں دونوں ٹرکوں کے عقب میں کھڑی کی گئیں اور پھر ان میں لاشوں کو لادنے کا کام شروع ہوا۔ پھر تیسری جیپ بھی لاشوں سے لوڈ کی گئی۔ یہ تینوں جیپیں سری نگر کی جانب روانہ ہو گئیں۔ یہ گاڑیاں جہاں جہاں سے گزریں بعد میں وہاں خون کی سرخ لکیریں دکھائی دیں۔ خون سے لت پت یہ گاڑیاں جب سری نگر شہر سے گزریں تو وہاں بھی ہماری کارروائی کی خبر پھیل گئی۔

دوپہر کے وقت میں نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا، ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد میں اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ ساتھیوں نے یہ دردناک خبر سنائی کہ عبداللہ بھائی اور فیاض احمد عرف طوطا جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ عبداللہ بھائی جس راہ کے مسافر تھے اس کی منزل یہی تھی۔ ان کا اصل نام نواب خان تھا اور تعلق اٹک (پاکستان) سے تھا۔ نہایت دلیر اور جری مجاہد تھے۔ فیاض احمد عرف طوطا گاندربل کے ایک مجاہد خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے خاندان کے دسویں شہید تھے۔ ان کا سارا خاندان تحریک اسلامی کا فدائی تھا۔ ہم نے شہدا کی خوش بختی پر خاصی دیر تک بات چیت کی اور پھر فاتحہ خوانی کی۔ اس کے بعد چند گھنٹے پہاڑ پر ہی آرام کیا۔ ساتھیوں کے پاس سوکھی روٹیاں تھیں، وہ بانٹ کر کھانے کے بعد اللہ کا

شکر ادا کیا۔۔۔ مغرب کی اذانوں کے ساتھ وہاں سے ایک دوسرے علاقے کی طرف رخت سفر باندھا۔ نالہ سندھ کے برفانی پانی کو ایک جگہ سے عبور کیا۔ سردی کی وجہ سے پانی کم ضرور تھا لیکن پانی کی ٹھنڈک سے ٹانگیں سن ہو گئیں۔ آدھی رات کے وقت محفوظ علاقے میں پہنچ کر ایک ہمدرد کے ہاں رات بسر کی۔

صبح جاگا تو ایک شخص نے میرے پاس آکر کہا، کمانڈر صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔ میں نے کہا، میں کسی کمانڈر سے واقف نہیں اور بہت تھکا ہوا بھی ہوں، اس لیے کسی کو ملنا ہے تو اس سے کہو یہیں آکر مل لے۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب مجاہدین کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا، حزب المجاہدین کے ڈپٹی سپریم کمانڈر برہان الدین حجازی ہیں۔ ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ بہت بہادر اور سراپا ایثار مجاہد کمانڈر ہیں۔ ملاقات سے ہم سب کو بہت خوشی ہوئی۔ انہوں نے بھی بڑی مسرت کا اظہار کیا اور تازہ کارروائی پر بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ مجاہدوں کی شہادت پر وہ افسردہ تھے۔ کچھ دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد وہ چلے گئے۔

اگلے روز ہمارے مقامی ساتھی قریبی بستی میں جا کر تازہ اخبارات لے آئے۔ تمام اخبارات میں ہماری جھڑپ کی تفصیلات شائع ہوئی تھیں۔ اخبارات کے ذریعے ہی معلوم ہوا کہ عبداللہ بھائی اور فیاض احمد عرف طوطا نے بھی شہید ہونے سے قبل بارہ بھارتی فوجیوں کو ہلاک کیا۔ ۲۳ بھارتی فوجی دو ٹرکوں میں میرے ہاتھوں واصل جہنم ہوئے تھے۔ اسی شام سری نگر سے پہلی بار کمانڈنگ افسرست پال کی ہلاکت کی خبر سنی۔ اس کے علاوہ ڈپٹی کمانڈنگ افسر مینا سمیت بہت سے افسروں اور فوجیوں کی ہلاکت کی بھی ریڈیو نے تصدیق کر دی۔

اسی روز حزب المجاہدین کے سپریم کمانڈر سید صلاح الدین نے مجھے بکمال

مہربانی پچاس ہزار روپے نقد اور ہلال جرات دینے کا اعلان کیا۔ میں نے نقد رقم لینے سے تو معذرت کر دی کہ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس کے مستحق وہ افراد ہیں جو اس کارروائی کے دوران شہید ہوئے یا جن کا مالی نقصان ہوا۔ البتہ ان کی طرف سے دیے گئے اعزاز کو میں نے اپنے لیے بہت عزت افزائی اور سامان خیر و برکت سمجھا۔ انعامی رقم سے دس ہزار روپے ان گھروالوں کو دیے گئے جہاں عبداللہ بھائی شہید ہوئے تھے اور بھارتی فوج نے بعد میں اس گھر کو تیس تیس کر دیا تھا۔ اس گھر سے ہماری دو نوجوان بہنوں کو بھی گرفتار کر کے تشدد و اذیت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ باقی رقم بھی ان افراد میں تقسیم کی گئی جن کے مختلف جھڑپوں کے دوران فوج نے مکانات وغیرہ تباہ کر دیے تھے۔

کنگن کے یادگار معرکے

اس کارروائی کے بعد میں حمزہ سنگریار اور عبدالرحمان بھائی کے ہمراہ واپس کنگن پہنچا۔ یہاں کے ایک پہاڑ پر ایک بوسیدہ گھر کو ہم نے اپنا ہائیڈ آؤٹ بنالیا۔ سردی کا موسم ہونے کی وجہ سے یہ گھر مکینوں سے خالی پڑا ہوا تھا۔ ہمارے دو سرے پاکستانی ساتھی سری نگر چلے گئے تھے۔ سردی کے دنوں میں پہاڑوں پر موسم کی شدت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ کئی کئی گز تک گہری برف میں زمین کے اندر سے بھی ٹھنڈا بلتی ہے اور اوپر سے برف کی شکل میں گرتی ہے۔ فوج کی نقل و حرکت بھی محدود ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں پر تو بھارتی فوجی آنے کا تصور بھی نہیں کرتے، جب تک کہیں سے ان پر حکم کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔ ہم نئے ہائیڈ آؤٹ پر کافی دن تک پر امن فضا میں رہے۔ کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی مقامی مجاہدین کے توسط سے مل جاتی تھیں۔

ایک دن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ کی چوٹی سے اتر کر نیچے آیا تو بھارتی فوج پر حملے کا ایک امکان پیدا ہو گیا۔ ”بیروزگاری“ کے زمانے میں یہ خوشی کی خبر تھی۔ شدید برف باری کی وجہ سے سری نگر سے لداخ جانے والی بھارتی فوجی گاڑیوں کی

آمد و رفت ان دنوں بند تھی، تاہم معلوم ہوا کہ کنگن سے سترکلو میٹر دور لداخ روڈ پر غنڈ نامی مقام تک گاڑیاں راشن لے کر جاتی رہتی ہیں۔ کنگن سے چند کلو میٹر دور نالہ سندھ کے کنارے پانچ سو میٹر کے فاصلے پر مختلف جگہوں پر ہمیں دو دو فوجی کھڑے نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ان کا یہاں موجود ہونا اس بات کا اشارہ تھا کہ فوجی گاڑیاں یہاں سے گزرنے والی ہیں۔ میں نے حمزہ سنگریار بھائی اور عبدالرحمان بھائی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔۔۔ ”شکار“

موجود ہے، تو پھر انتظار کس بات کا۔۔۔؟“

میرے علاوہ عبدالرحمان بھائی کے پاس بھی پیکا گن تھی۔ ہم نے سڑک کی دو سری جانب دریا کے اس پار کو گھات لگانے کے لیے چنا۔ دن ایک بجے کے قریب چند فوجی گاڑیاں ہمارے سامنے سے گزریں۔ ان گاڑیوں پر پہلے عبدالرحمان بھائی کو فائر کرنا تھا اس کے بعد ہم سب نے فائر کھولنا تھا، لیکن عبدالرحمان بھائی کی توجہ کسی دو سری جانب رہی اور گاڑیاں آنا "فانا" ان کی ریج سے نکل گئیں۔ میں نے عبدالرحمان بھائی کی طرف دیکھا، تو انہوں نے مسکرا کر معذرت کی۔ ہم نے دوبارہ منصوبہ بندی کی اور فوجی گاڑیوں کا انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹے تک مزید اسی جگہ لیٹے رہے۔۔۔ ہماری انگلیاں ابھی تک ٹرائیگروں پر جمی ہوئی تھیں۔ کنگن کے کمپنی کمانڈر اور ڈپٹی کمپنی کمانڈر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ ہم سے چند سو میٹر دور گھات لگائے بیٹھے تھے۔ ہمیں فوجی گاڑیوں کے واپس آنے کی امید اب زیادہ نہیں تھی، لیکن پیدل فوجیوں کی موجودگی سے فوجی گاڑیوں کے یہاں سے گزرنے کی امید لگائے ہم لیٹے رہے۔ اس دوران میں سری نگر کی جانب سے سات گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ یہ تصور خوش کن تھا کہ ان گاڑیوں نے ہمارے سامنے سے گزر کر جانا تھا۔ اس مرتبہ پہلا فائر میں نے کرنا تھا۔ جوں ہی ایک گاڑی میری گن کی

ریج میں آئی، میں نے اس پر فائر کھول دیا۔ گاڑی سڑک کے کنارے ایک درخت سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے ساتھیوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ گاڑیوں میں راشن لدا ہوا تھا اور اوپر فوجی گنیں پکڑے بیٹھے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی دوسری گاڑیوں کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ تیزی سے کنگن شہر میں داخل ہو گئیں۔ ایک فوجی گاڑی موڑ کاٹ رہی تھی کہ سامنے سے ایک سول بس آ گئی۔ سڑک تنگ تھی اور پھر موڑ بھی تھا، اس لیے فوجی گاڑیوں کا رکنا ناگزیر تھا۔ جوں ہی فوجی گاڑی نے بریک لگائی۔ ٹرک کی چھت پر بیٹھے ہوئے فوجیوں نے بدحواسی میں یہ سمجھ کر مجاہدین دوبارہ آگئے ہیں، اس سول بس پر فائرنگ کر دی۔ اس سے بس کا بے گناہ ڈرائیور شہید ہو گیا جبکہ ایک خاتون اور بچہ شدید زخمی ہو گئے۔ اگلے روز ہمیں اطلاع ملی کہ ہماری فائرنگ سے ایک فوجی ہلاک اور چھ شدید زخمی ہوئے۔ یہ ۲۶ جنوری ۱۹۹۳ء کا دن تھا۔

اس کارروائی کے بعد ہم چاروں دو دن تک اسی پہاڑی ٹھکانے پر مقیم رہے۔ مقامی مجاہدین اور ہمدردوں کو ہماری یہاں موجودگی کی خبر ہو چکی تھی، اس لیے انہوں نے اشیائے خورد و نوش پناہ گاہ میں پہنچا دیں۔ سردی اپنے جو بن پر تھی۔ ہمارے پاس گرم کپڑے وافر تھے۔ دن کو دھوپ اور رات کو آگ سے جسم کو گرم رکھتے۔ دن کے وقت ہم جنگل سے بہت سی لکڑیاں ڈھولیتے اور پھر راتوں کو آگ جلا کر اس کے ارد گرد بیٹھ کر باتیں کرتے۔ لیکن چند دن بعد ہی ہم تنہائی اور بے کاری سے اکتا گئے۔ حمزہ سنگریا نے کہا۔۔۔ ”کب تک یہاں بیٹھے آگ سینکتے اور روٹیاں توڑتے رہیں گے، باہر نکل کر دشمن کو تلاش کرنا چاہیے۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں، تو دشمن بھی مطمئن ہو گیا ہے۔“ میں نے بھی حمزہ بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا، ”ہمیں ”شکار“ کی تلاش میں نکلنا چاہیے۔“

۲۹ جنوری ۱۹۹۲ء کی صبح ہم گہری نیند سے بیدار ہوئے۔ پانی گرم کر کے وضو کیا اور رب دو جہاں کے حضور سرسجود ہو گئے۔ ناشتے کے بعد ہم نے گتیں اٹھائیں اور ٹھکانے سے باہر نکلے۔ کنگن کے پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف پر سورج کی کرنیں چمک رہی تھیں۔ منی گام سے آگے تک پھیلے ہوئے اس پہاڑی سلسلے کا دل فریب منظر ہمارے سامنے تھا۔ پہاڑ ہی کی ایک بلند پگڈنڈی پر ہم نے سفر شروع کیا۔ نیچے اترنے کی صورت میں فوج سے سامنا یقینی تھا۔ گزشتہ حملوں کے بعد فوج کی بھاری نفری اس علاقے میں تعینات کر دی گئی تھی۔ اس روز ہماری منزل کنگن سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں تھا۔ ایک کچے راستے پر چلتے ہوئے ایک گھنٹے بعد ہم اس گاؤں کے اوپر جا پہنچے۔

گزشتہ کامیاب حملوں نے بھارتی فورسز میں زبردست خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا اور انہوں نے ممکنہ حد تک حفاظتی اقدامات سخت کر دیئے تھے۔ جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں نئی نفری منگوالی گئی تھی اور جو کیمپ غیر محفوظ تھے وہاں سے فورسز نے چلے جانے میں ہی عافیت جانی۔ کاواچیرون میں بارڈر سیکورٹی فورس کا ایک بہت بڑا کیمپ تھا جہاں ہمہ وقت دو سو سے زیادہ اہلکار موجود رہتے تھے۔ یہ کیمپ اس سکول میں قائم کیا گیا تھا جہاں تحریک آزادی سے قبل علاقے کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن کشمیر کے طول و عرض میں گولیوں اور گولوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی تو اس سکول کو بھی بی ایس ایف نے قبضے میں لے کر فوجی کیمپ میں تبدیل کر دیا۔ گاؤں کے بچے مجبوراً گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بی ایس ایف کے اس ظالمانہ اقدام نے گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں نفرت بڑھا دی تھی۔ مجنروں نے ہمیں دو روز قبل ہی اطلاع دے دی تھی کہ بی ایس ایف اس کیمپ کو غیر محفوظ تصور کر کے خالی کر رہی ہے۔

دن کے دس بجے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کیمپ میں پہنچا تو بی ایس ایف کیمپ کو خالی کر کے جا چکی تھی۔ کیمپ کو مقامی افراد نے گھیرا ہوا تھا، لیکن بی ایس ایف کے ظلم اور جبر کا احساس اب بھی ان کے دل و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ وہ کیمپ کے اندر جانے سے کترار رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا تو سب کے قدم ہماری طرف اٹھنے لگے۔ ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ میں ان کے ساتھ کیمپ کے اندر داخل ہوا۔ بکرو وغیرہ توڑ دیے گئے تھے، تاہم کیمپ کے اندر اشیائے ضرورت کافی تعداد میں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے مقامی لوگوں سے کہا کہ وہ یہ سامان اٹھا کر گھروں کو لے جائیں، چند افراد نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک بی ایس ایف کی دوبارہ آمد سے خوفزدہ تھے۔ میں نے کہا کہ یہ سب کچھ آپ کا ہے اور بی ایس ایف انشاء اللہ اب اس طرف نہیں آئے گی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر کیمپ کا سارا سامان مقامی لوگوں نے گھروں میں منتقل کر دیا۔ بیروں کی کھڑکیاں اور دروازے نکال کر بھی میں نے مقامی افراد میں تقسیم کر دیے اور کیمپ کو آگ لگا دی، تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اب کم از کم یہاں کسی فوجی کیمپ کے دوبارہ قائم ہونے کے امکانات ہم نے ختم کر دیے تھے۔

بھارتی فورسز کے مظالم اور زیادتیوں سے مشتعل لوگوں نے قریب ہی واقع ایک سرکاری فیکٹری پر بھی ہلہ بول دیا۔ ان دو کارروائیوں پر مقامی افراد بہت خوش تھے۔ کشمیریوں کو ناکردہ جرائم کی جو سزا دی جاتی ہے اور بھارتی فورسز جب چاہیں کسی کشمیری کو تشدد اور اذیت کا نشانہ بناتے ہیں، اس سے ہر سینے میں انتقام کی آگ دہک رہی ہوتی ہے۔ ان عمارتوں کو آگ اسی جذبے کے تحت لگائی گئی۔ لوگ اس احساس سے ہی پرسکون اور مطمئن تھے کہ بھارتی فوج اب دوبارہ یہاں کیمپ قائم نہیں کر سکے گی اور اگر اس نے ایسا کیا تو اسے نئی عمارت بنانی پڑے گی۔

گاؤں کے بہت سے افراد کی خواہش تھی کہ ہم ان کے گھروں میں قیام کریں، ہم نے ان سے معذرت کرتے ہوئے ایک خوش حال اور مجاہدین کے سرپرست گھرانے میں قیام کیا۔ کشمیر کی دوسری بستیوں کی طرح یہاں بھی خوش حالی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ لیکن لوگوں کی مہمان نوازی اور مجاہدین سے والہانہ لگاؤ اپنی مثال آپ ہے۔

اگلے دن علی الصبح ہم ایک قریبی گاؤں مرگنڈ روانہ ہوئے۔ چند مقامی مجاہدین اور بہت سے نوجوان اور بچے بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ مرگنڈ میں ایک بہت بڑا میدان ہے جہاں پہلے بچے اور نوجوان کھیلا کرتے تھے۔ اسی میدان کے آخری کنارے پر ایک عمارت میں واٹر سپلائی اور محکمہ فشریز کے دفاتر تھے۔ ان سرکاری دفاتر کو دیکھ کر ہمارے مقامی ساتھیوں کی آتش انتقام بھڑک اٹھی، یہاں پر بھی فوج کے کیمپ قائم ہونے متوقع تھے۔ مسلح مجاہدین کی موجودگی کی وجہ سے مقامی افراد کے دلوں سے خوف نکل چکا تھا۔ سب نے مل کر ایک گھنٹے کے اندر اندر اس عمارت کو بھی زمین بوس کر دیا۔ مقامی افراد ان عمارتوں کو تباہ کرنے میں اس لیے بھی پیش پیش تھے کہ آج نہیں تو کل ان عمارتوں پر فوج نے قبضہ کر کے انہیں فوجی کیمپوں میں تبدیل کر کے بے گناہ اور معصوم افراد کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنانا تھا۔

کچھ دن بعد فوج کو ان مقامات پر کیمپ قائم کرنے کا حکم ملا۔ وہ گاڑیوں کے ذریعے وہاں پہنچی تو سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ انہوں نے حسب عادت مقامی افراد کو تشدد کا نشانہ بنانا شروع کر دیا، اس پر لوگوں نے کہا۔۔۔۔۔ ”ہمیں کس جرم میں پیٹ رہے ہو، یہ سب کچھ تو مجاہدین نے کیا ہے، ان سے پوچھ گچھ کرو۔“ چنانچہ ان دونوں گاؤں میں کیمپ قائم کرنے میں ناکام رہنے کے بعد فورسز نے کنگن میں ایک نیا کیمپ تعمیر کر کے حکام بالا کے حکم سے گلو خلا صی پائی۔

اس علاقے میں دو روز قیام کے بعد ہم واپس پہاڑ پر اپنے ٹھکانے پر چلے گئے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ کوئی اچھی سی پناہ گاہ بنا کر سردی کی شدت کا مقابلہ کیا جائے۔ ایک مقامی ساتھی جو ہماری ضروریات پوری کرنے کے ذمہ دار تھے، حد درجہ ہمارا خیال رکھتے تھے۔ سارا دن ہماری ضروریات مہیا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ اپر گراؤنڈ کام کرتے تھے اور کئی برس تک فوج اور اس کے مخبروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہمارے لیے کام کرتے رہے تھے۔ ہماری واپسی کے بعد معلوم ہوا ہے کہ وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ انہوں نے ہمارے لیے راشن، مزدوروں، گھوڑوں اور دیگر ضروریات کا فوری بندوبست کیا۔ ہم نے چند دن کی محنت سے ایک زیر زمین پناہ گاہ تعمیر کی۔ لکڑی کے تختے وغیرہ جوڑ کر ہم نے اسے باقاعدہ ایک کمرے کی شکل دی۔ باہر جانے کے لیے خفیہ جگہ پر ایک دروازہ بنایا۔ پھر اپنا سامان اس میں منتقل کیا۔ اس سے دوسو میٹر کے فاصلے پر ایک کھلی جگہ ہمارا باورچی خانہ تھا۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے دوران ہی حبیب اللہ بخاری، طاہر اسحاق اور اسد اللہ بھی سری نگر سے ہمارے پاس آ پہنچے۔ انہوں نے بھی اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اب قدرے سکون سے ہمارے شب و روز بسر ہونے لگے۔

چند دن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نئی پناہ گاہ میں گزارنے کے بعد ایک روز ساتھیوں سے اجازت لے کر میں تنہا ہی نیچے گاؤں میں چلا گیا۔ میں گاؤں کے بایسیوں سے ملاقات کرنا چاہتا تھا اور یہ خواہش بھی تھی کہ اگر موقع ملے تو ایک آدھ چھوٹی موٹی کار روائی بھی کر لی جائے۔

یہ فروری ۱۹۹۵ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ مقامی لوگوں اور مجاہدین سے ملنے اور حالات کی سن گن لینے میں دو تین گھنٹے صرف ہوئے۔ اتنی دیر میں کار روائی کے لیے دماغ

میں ایک نیا منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں قریبی گاؤں اکھال کی طرف
 روانہ ہو گیا۔ اکھال کے ساتھ ہی کنگن چک کا گاؤں ہے جہاں فوج کا ایک کیمپ
 تھا۔ میں نے دور سے دیکھا وہاں کافی چمپل پہل تھی۔ فوجی ادھر ادھر آ جا رہے تھے
 اور بعض کھڑے گپ شپ میں مصروف تھے۔ میرے ساتھ گاؤں کے چند اپر
 گراؤنڈ کام کرنے والے لڑکے بھی تھے۔ ان کے پاس لڑنے کے لیے ”سامان“ نہ
 تھا، تاہم ان سے مجھے تمام بنیادی معلومات ملیں۔ میں ان سے اس کارروائی کے
 سلسلے میں بھی مدد لینا چاہتا تھا۔ یہ ظہر کا وقت تھا۔ میں نے فوجیوں کو دیکھا پھر گم
 و نواح کا جائزہ لیا تو ایک مختصر سی کارروائی کے لیے محل وقوع کو موزوں پایا۔ میں
 نے کم سن مجاہدوں کو ہدایت کی کہ وہ غیر محسوس طریقے سے کیمپ کے ارد گرد پھیل
 جائیں اور جب دیکھیں کہ میرا نکل جانا ضروری ہے تو سیٹی بجا کر مجھے مطلع کریں۔
 پیکا گن میرے پاس تھی جس کا زیادہ حصہ میں نے فرن کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ باقی
 حصے کو چھپانے کے لیے میں نے گھاس کا ایک گٹھا سر پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد
 میں کیمپ کے قریب سے گزرتا ہوا کوئی دو سو میٹر اوپر چلا گیا۔ ایک پرانے درخت
 کی اوٹ میں گھاس کا گٹھا اتارا اور بیٹھ گیا۔ فوجی کیمپ پہاڑ کے دامن میں قدرے
 ہموار جگہ پر اور چاروں اطراف سے کھلا تھا۔ فوجی ابھی تک خوش گپیوں میں
 مصروف تھے۔ میں چند منٹ تک کیمپ کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد اٹھا اور
 درختوں کی آڑ لیتے ہوئے کیمپ سے ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر گھاس پھونس کے
 ایک ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے اپنی پیکا اتاری اور اس کا پٹہ چڑھایا۔ گھاس
 کے ڈھیر سے دو گز آگے ایک درخت تھا۔ میں نے گن اس ڈھیر کے پیچھے رکھی پھر
 اس درخت کی اوٹ میں چند پتھر جوڑ کر گن درخت کے ساتھ فٹ کر دی۔ یہ کام
 چند منٹ کے اندر مکمل ہو گیا۔ ہاتھوں سے میں کام کر رہا تھا لیکن آنکھیں چاروں

طرف دیکھ رہی تھیں۔ یہ اللہ کا خصوصی فضل تھا کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ اپنا چھوٹا سا مورچہ قائم کرنے کے بعد میں نے اپنے نشانے کی جانب توجہ کی۔ کیمپ کے کونے میں مجھ سے ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر آٹھ فوجی بڑی دیر سے گپیں ہانک رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بھی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے انہی کو ہدف بنانے کا فیصلہ کیا اور انہیں نشانہ بنانے میں تاخیر نہیں کی۔ اس گروپ کا نشانہ لے کر ایک برسٹ مارا۔ چند لمحوں کے اندر اندر وہ سارے فوجی زمین پر تڑپ رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے چند مزید فائر کیمپ کی جانب کیے۔ آنا فانا کیمپ میں قیامت مچا ہو گئی۔ میں اتنی ہی ہل چل مچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ چیخ و پکار کے بعد جیسے ہی بھارتی گنوں سے فائرنگ شروع ہوئی اور فوجی کیمپ کے ارد گرد پوزیشنیں لینے کی جدوجہد میں مصروف ہوئے، مجھے اپنے ساتھیوں کی سیٹیوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد میں نے وہاں سے نکل جانے میں لمحے بھر کی دیر نہیں کی۔ کیمپ کی حدود سے نکل کر میں منصوبے کے مطابق جنگل میں داخل ہو گیا۔ فوجی اب مارٹر شیلنگ کر رہے تھے، لیکن ان کو ہدف کا پتہ نہیں تھا۔ کوئی دو ہزار میٹر کی بلندی پر ایک چشمے کے کنارے جا کر میں نے پڑاؤ ڈالا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میرے معاون چار ساتھی بھی آ پہنچے۔ میں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور تھپکیاں دیں۔ ان کا گاؤں میں ٹھہرنا خطرناک تھا، اس لیے انہیں میں نے ہدایت کی تھی کہ وہ حملے کے بعد اس چشمے کے کنارے پہنچ جائیں۔ چار بجے کے لگ بھگ فوج کی فائرنگ بند ہوئی۔ اس دوران موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، جو اپنے ساتھ شدید سردی کا ریلہ بھی لے آئی۔ بارش سے بچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ ایک درخت تلے بیٹھ کر ہم نے کسی قدر خود کو بھگنے سے بچایا۔ مغرب کے بعد گاؤں سے ایک شخص ہمارے لیے کھانا لے

کر آگیا۔ رات ہم نے اسی درخت کے نیچے سردی سے ٹھہرتے ہوئے گزار دی۔ اگلے تین دن میں نے پہاڑ پر ہی چلتے پھرتے گزارے۔ ایک دو مقامی نئے مجاہد ساتھی میرے ہمراہ رہتے تھے۔ میں نے انہیں گرینیڈ اور پستول وغیرہ دے رکھے تھے۔

ایک روز عصر کی نماز کے بعد میں ”دیکھ بھال“ کے لیے ایک بار پھر اس کیمپ کے اوپر پہنچا۔ ہر مرتبہ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ کارروائی شام سے کچھ دیر قبل کی جائے تاکہ فوجی گھیرے میں پھنس جانے کی صورت میں رات کے اندھیرے میں نکل جانے کا امکان ہو۔ میں اپنی پیکا کے ہمراہ کیمپ سے ڈیڑھ دو سو میٹر کے فاصلے پر پہنچا۔ پہلے میرا خیال تھا کچھ دیر تک ادھر ادھر گھوم کر واپس چلا جاؤں گا، لیکن جب دیکھا کیمپ کے اندر ایک پتھر پر دو فوجی بالکل سامنے بیٹھے ایک کتاب پڑھ رہے ہیں تو طبیعت للچا گئی۔ کیمپ کے چاروں اطراف بکر بن چکے تھے، لیکن میں ان بکروں میں بیٹھے فوجیوں کی نظروں سے او جھل تھا۔ پچاس میٹر کا مزید فاصلہ طے کر کے میں ان دونوں فوجیوں کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی پیکا گن فٹ کی اور صرف دو فائر کر کے ان دونوں فوجیوں کو ڈھیر کر دیا۔ ابتدا میں میرے منصوبے میں صرف ان ہی دو فوجیوں کو ٹھکانے لگانا شامل تھا، لیکن دو فائر کر کے دل نہ بھرا تو میں نے گن کا رخ سامنے ایک کمرے کی طرف موڑا۔ اس کمرے کی کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوئے تھے، میں نے چند فائر کمرے کی کھڑکیوں اور دروازے پر کیے اور جلدی سے پیکا اٹھائی اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ حسب معمول فوج نے مارٹر شیلنگ اور فائرنگ شروع کر دی، تاہم انہیں میرے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکا اور میں خیریت سے اپنے پہاڑی ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

چند دن پہاڑی ٹھکانے پر تنہا ہی گزارے۔ کبھی کبھار چند مقامی مجاہد آ جاتے تو

ان سے گپ شپ ہو جاتی، ورنہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ پاکستانی مجاہد ساتھیوں سے بچھڑے کافی دن ہو چکے تھے۔ اس دوران برف باری نے حالات مزید مشکل کر دیے، لیکن جہاد کی راہ میں اس طرح کی سختیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ گزشتہ دو کارروائیوں کے نتیجے میں فوج نے کنگن کے پورے علاقے کو چھان مارا جس کی وجہ سے مقامی مجاہدین کو گاؤں چھوڑ کر جنگلوں میں پناہ لینی پڑی۔ ان کارروائیوں کی وجہ سے فوج پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا۔ اب ہر کیمپ کے فوجی رات دن جاگ کر میرا انتظار کرتے تھے۔

چار دن بعد میں دوبارہ نیچے اترا۔ اس مرتبہ میرا ہدف ایک بار پھر کنگن کا فوجی کیمپ تھا، جہاں اندازاً ایک ہزار فوجی مقیم تھے۔ اس کیمپ سے لگ بھگ چار سو میٹر کے فاصلے پر لداخ کی جانب چار منزلہ سرکاری فلیٹ بنے ہوئے ہیں جہاں مختلف سرکاری محکموں کے ملازمین رہائش پذیر ہیں۔ دس بجے دن ان فلیٹوں میں آمدورفت کم تھی۔ ملازمین دفاتر چلے گئے تھے اور بچے سکولوں میں تھے، میں نے ان فلیٹوں کی راہ لی۔ فرن کے اوپر ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا اور گن فرن کے نیچے تھی۔ صرف بالائے زمین کام کرنے والے چند نو عمر مجاہدوں کو علم تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ انہوں نے ہی مجھے ان فلیٹوں کے متعلق معلومات بھی فراہم کی تھیں۔ خاموشی سے زینے سے ہوتا ہوا میں چار منزلہ عمارت کی چھت پر پہنچا۔ وہاں سے کیمپ ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کیمپ کا باورچی خانہ سب سے قریب تھا، وہاں ایک درجن کے لگ بھگ فوجی موجود تھے، مزید بھی آ رہے تھے۔ میں نے زیادہ انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چھت پر ایک چارپائی پڑی تھی، اسے ایک جگہ کھڑا کیا اور اس کی آڑ میں اپنی پیکا گن فٹ کی۔ باورچی خانے میں کھڑے فوجیوں پر فائر داغے اور چند لمحوں میں اپنی گن اٹھائی، کمبل لپیٹا اور سیڑھیاں اتر کر جنگل کی

راہ لی۔ ان فلیٹوں کے مکینوں کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ کوئی مجاہد ان کے گھروں
 کی چھت پر بیٹھ کر کارروائی کر گیا ہے۔ کئی منٹ بعد جب میں فوجیوں کی پہنچ سے
 دور ہو گیا تب کہیں جا کر ان کی گنوں کے دھانے کھلے لیکن وہ فائر کس پر کرتے، البتہ
 ہوا اور جنگل کو اپنا نشانہ بنا کر انہوں نے دل کا خوف دور کرنے کی کوشش ضرور کی۔
 چند دن میں نے اسی جنگل میں گزارے۔ کھانا وغیرہ گاؤں سے کوئی دے جاتا
 تھا اور رات کسی درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے سو کر گزار لیتا تھا۔ اس زندگی میں کسی
 شہری بود و باش رکھنے والے کے لیے شاید کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن میرے لیے اس
 میں سکون و لطف کا خاصا سامان موجود تھا۔ ایک دن پھر نیچے اتر آیا۔ اب اس
 علاقے کے لوگ مجھے اچھی طرح پہچان گئے تھے، اس لیے جوں ہی کسی گاؤں میں
 داخل ہوتا تھا، گاؤں کے افراد کو یقین ہو جاتا تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔
 چنانچہ وہ محفوظ مقامات کی طرف چل پڑتے، تاکہ کارروائی کے بعد فوج کی دست
 ظلم سے محفوظ رہ سکیں۔ میرے پے درپے حملوں کی وجہ سے اس علاقے میں فوج
 نے گشت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس روز میں ایک شہید کے گھر چلا گیا۔ گھر کے افراد
 نے میری آؤ بھگت کی۔ یہ گھر سڑک سے تھوڑی ہی دور تھا۔ کھانا وغیرہ کھانے کے
 بعد میں مکان کے باغیچے میں چلا گیا۔ دو کنال پر محیط اس خوبصورت باغ میں پھل
 دار درختوں کی کثرت تھی۔ میں نے وہاں سے سڑک کا جائزہ لیا۔ ایک آدھ فوجی
 گاڑی تھوڑے تھوڑے وقفے سے گزر رہی تھی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ
 کارروائی ہو سکتی ہے۔ سڑک سے ایک سو میٹر کے فاصلے سے میں نے حملے کا
 پروگرام بنایا۔ اپنی پیکاگن میں نے ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کی اوٹ میں فٹ کی اور
 گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد آدھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک موٹر
 سے چار فوجی گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ ان میں دو ون ٹن ٹرک تھے، جب کہ دو فوجی

جیسے تھیں۔ میں فوری طور پر ایک محدود حملے کا پروگرام ہی بنا سکتا تھا، پھر میں تنہا بھی تھا۔ گاڑیاں قریب آئیں تو ایک ٹرک کے پیچھے بیٹھے ہوئے فوجیوں پر میں نے برسٹ مارا اور تیزی سے پیکا اٹھائی اور جنگل کی راہ لی۔ میرے حملے سے چند فوجی خون میں نہا کر گر گئے۔ LMG لیے کھڑا فوجی بھی گرنے والوں میں شامل تھا۔ باقی گاڑیاں وہاں سے بھاگ گئیں، کسی نے بھی جوابی کارروائی کی جرات نہیں کی۔

دو روز میں نے جنگل میں گزارے۔ اس دوران بٹالین کمانڈر ملنے آئے۔ انہوں نے تازہ کارروائیوں پر میری حوصلہ افزائی کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ مل جل کر کارروائیاں کرنا زیادہ موثر ہو گا۔ گزشتہ ایک ماہ کے عرصے میں اس جنگل میں جو چھوٹی موٹی میں کارروائیاں کرتا رہا، ان کے نتیجے میں فوج کا خاطر خواہ جانی نقصان ہوا تھا۔ میں نے اس دوران ستر کے قریب فائر کیے تھے اور شاید ہی کوئی فائر خطا گیا ہو۔ تاہم میری پیکا کا پٹہ بھی آہستہ آہستہ خالی ہو رہا تھا جس کی مجھے فکر تھی۔ اس کے علاوہ کمانڈر بلال کی رائے کا بھی مجھے احترام تھا۔ دو روز کے وقفے کے بعد میں نے اس گاؤں کی راہ لی جہاں میں نے مقامی افراد کے ہمراہ فوج کے دو کیمپوں کو نابود کیا تھا۔

کنگن میں میری کارروائیوں کی مختلف اخبارات میں تفصیلی رپورٹ حزب المجاہدین کے نام سے شائع ہوتی رہی۔ غلام محمد لون کنگن کے معروف صحافی تھے جن کا تعلق جماعت اسلامی سے تھا۔ وہ ہی ان خبروں کو مختلف اخبارات میں شائع کرواتے تھے۔

ایک دن دس بجے کے قریب میں سڑک کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ میں نے بھارتی فوج کی وردی زیب تن کی ہوئی تھی اور پیکا گن کندھے پر تھی۔ اس دوران میرے پیچھے سے فوج کا ایک گشتی دستہ آ نکلا۔ تمیں فوجی ایک قطار میں چل

رہے تھے۔ مجھے بھی ان کی موجودگی کی خبر ہو گئی تھی لیکن مجھے کوئی خاص فکر نہ ہوئی۔ اب کشمیر میں فوجی میرے لیے خوف کی علامت نہیں تھے، میں بھی فوج کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے اور میری پیکا گن سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ کسی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر میں نے سڑک پر اپنا سفر جاری رکھا۔ مجھے اتنا اندازہ تھا کہ وہ مجھ پر آسانی سے حملہ نہیں کر سکیں گے۔ اس کے باوجود کوئی موڑ آتا تو میں ان کی نظروں سے او جھل ہو کر دوڑ لگا دیتا۔ اس طرح آہستہ آہستہ میرا اور ان کا فاصلہ بڑھتے بڑھتے بالا خر دو کلومیٹر ہو گیا۔ میں نے اسی بھاگ دوڑ میں اپنے ذہن میں ایک کارروائی کو حتمی شکل دے ڈالی۔

راستے میں پرنگ نامی جگہ کے قریب ایک نہر پڑتی تھی جس کے قریب بی ایس ایف کا چالیس پچاس افراد پر مشتمل ایک دستہ دن بھر پہرے پر موجود رہتا تھا۔ میں نہر سے دو سو میٹر پہلے ہی سڑک کے قریب بڑے بڑے پتھروں میں چھپ گیا۔ فوجیوں کا دستہ جیسے ہی ایک سو میٹر کے فاصلے پر پہنچا میں نے اس پر دو فائر داغ دیے۔ اگلے ہی لمحے میں نے سامنے بی ایس ایف پر بھی چند فائر کر دیے۔ اس کے بعد تیز تیز قدموں سے پہاڑ پر چڑھنے لگا، میرا مقصد پورا ہو گیا تھا اور میری توقع کے مطابق ایک دلچسپ ڈرامے کا آغاز ہو چکا تھا۔ فوج نے بی ایس ایف پر مارٹر شیلنگ شروع کر دی تھی اور بی ایس ایف فوج پر پوزیشن لے کر اندھا دھند فائرنگ کر رہی تھی۔ ان کے درمیان چار سو میٹر کا فاصلہ تھا۔ دونوں کے درمیان جھڑپ نے شدت اختیار کر لی۔ کچھ دیر بعد فوج نے پیچھے اپنے کیمپ کو اطلاع دی کہ افغان مجاہدین کے ایک بہت بڑے گروپ سے ان کا مقابلہ ہو رہا ہے جس کے پاس جدید قسم کا اسلحہ ہے، اس لیے کمک بھجوائی جائے۔ فوج کے لیے کنگن کیمپ سے گاڑیوں کے ذریعے کمک آ پہنچی۔ میں ان گاڑیوں کو آتے دیکھ رہا تھا۔ دوسری

جانب بی ایس ایف نے مجھے فوجی وردی میں دیکھ لیا تھا اس لیے انہوں نے مجھے فوجی ہی سمجھا۔ میں نے ان پر فائر کیے تو وہ سمجھ گئے کہ فوج نے جان بوجھ کر ان کو نشانہ بنایا ہے۔ وہ فوج کے خلاف پہلے ہی جلے بھنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوجیوں پر فائر کھول دیا تھا۔ ان کے درمیان وائرلیس سیٹ کے ذریعے رابطہ قائم نہیں ہو سکا اس لیے فوجی بدستور انہیں ”اگر وادی“ سمجھ کر مار رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بی ایس ایف کے نزدیکی کیمپ سے بھی بہت سے سپاہی آگئے اور وہ بھی ”دشمن“ پر حملے میں شریک ہو گئے۔ صبح دس بجے شروع ہونے والی یہ جھڑپ شام کا اندھیرا چھانے تک جاری رہی۔ تب جا کر انہیں پتہ چلا کہ وہ ایک دوسرے ہی کو خون میں نہلا رہے ہیں۔ اس وقت تک دونوں طرف کے بیس فوجی مارے جا چکے تھے، جب کہ چالیس کے لگ بھگ شدید زخمی ہوئے۔ دوسری طرف مجاہدین اور عوام میں غم و اندوہ چھایا ہوا تھا، انہیں خبر ملی تھی کہ پاکستان سے آنے والے درجنوں مجاہد فوج سے جھڑپ میں شہید ہو گئے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک اہم کامیابی تھی اور میرے جہادی تجربات میں ایک دلچسپ اضافہ تھا۔ لون صاحب نے اخبارات کو خبر دی کہ شاہین بھائی کی قیادت میں مجاہدین کی فوج سے خون ریز جھڑپ ہوئی جس میں درجنوں فوجی مارے گئے۔ اگلے دن پو پھٹے فوج نے اس علاقے کی ناکہ بندی کر کے لاشوں کو اٹھانے کا کام مکمل کیا۔

اس جھڑپ اور اس علاقے میں ہونے والی دوسری کارروائیوں کی بازگشت اخبارات کے ذریعے پوری وادی میں سنائی دینے لگی۔ سوپور میں صابر بھائی، خالد بھائی، حافظ منشا قمر اور عبدالستار بھائی نے جب یہ خبریں پڑھیں تو ان کے دل میں بھی میرے ساتھ مل کر کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ یہ چاروں مار دھاڑ کرتے ہوئے کنگن میں میرے پاس پہنچ گئے۔ ان سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ کشمیر میں

قیام کے دوران اہل کشمیر نے بے وطنی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا۔ اس کے باوجود جب کوئی پاکستانی ساتھی ملتا تو خوشی دوچند ہو جاتی تھی۔ تنظیم کے علم میں جب سے یہ بات آئی تھی کہ میں اکیلا ہی یہ کارروائیاں کر رہا ہوں تو مجھے ہدایت کی گئی کہ میں دوسرے مجاہدین کے ساتھ مل کر کارروائیاں کروں۔ میرے پاس اب راؤنڈ بھی دو سو رہ گئے تھے، مجھے مزید ایمونیشن کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ کنگن کے مقام پر ہمارا ایک اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں باہمی مشورے سے ہم نے البدر سکوڈ تشکیل دیا۔ اس میں میرے علاوہ حمزہ سنگریار، حافظ منشا قمر، حبیب اللہ بخاری اور صابر بھائی بھی موجود تھے، پانچ مقامی مجاہدین بھی اس سکوڈ کا حصہ تھے۔ باقی ساتھیوں کو دوسرے کام سونپے گئے۔ برہان الدین حجازی صاحب نے بہت شفقت فرماتے ہوئے ہمارے سکوڈ کی ہتھیاروں اور ایمونیشن کی ضروریات پوری کر دیں۔

نئے گروپ کی تشکیل اور اسلحے کی ضرورت پوری ہونے کے بعد سب ساتھیوں نے فوج پر ایک زوردار حملہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ساتھیوں نے مشاورت کے بعد یچہامہ کے مقام پر کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس مقام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس سے قبل بھی یہاں میں دو کارروائیاں کر چکا تھا۔ ایک روز عصر کی نماز کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ رات ہم نے جنگل میں گزاری۔ کھانا وغیرہ قریبی گاؤں سے بھیج دیا گیا تھا۔ اگلے دن ہم اس مقام پر پہنچے جہاں کارروائی ہونا طے پائی تھی۔ یہ مقام کنگن سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر لداخ کی جانب واقع ہے۔ اس کے قریب ہی نالہ سندھ پر ایک پل ہے۔ اس مقام کے دونوں اطراف چند سو میٹر کے فاصلے پر دو چشمے ہیں جن کا پانی کچھ دور جا کر ندی میں گر جاتا ہے۔ سارا علاقہ پتھر والا ہے اور کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گاؤں

سے یہ جگہ ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، جنگل بھی ہم سے ایک کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ حمزہ سنگریار، صابر بھائی اور حبیب اللہ بھائی کو میں نے گاؤں کے قریب پوزیشنیں لینے کے لیے بھیج دیا۔ ان کے پاس سنائپر اور کلاشن کوفیں تھیں۔ تین ساتھیوں کو میں نے پیکاگن کے ساتھ چشے کے اندر ایک دیوار کی اوٹ میں پوزیشنیں لینے کو کہا۔ ہم بہت خاموشی سے اپنی پوزیشنیں سنبھال رہے تھے، ہمارے بالکل سامنے دریا کی دوسری طرف فوجی پہرہ دے رہے تھے، لیکن وہ ہماری سرگرمیوں سے بے خبر رہے۔

فوجی قافلوں پر حملے

پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی اور موسم میں خوشگوار تبدیلی آچکی تھی۔ سری نگر اور لداخ کے درمیان سڑک ہر قسم کی ٹریفک کے لیے کھل چکی تھی۔ ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ لداخ سے اتوار اور جمعے کے علاوہ ہر روز دو سو گاڑیوں کا ایک قافلہ سری نگر جاتا ہے۔ یہی قافلہ ہمارا نشانہ تھا۔

شام چار بجے گاڑیوں کی آمد شروع ہوئی۔ پیکاگن سمیت میں نے ایک کھیت میں سڑک سے کوئی ایک سو میٹر کی بلندی پر پوزیشن لی ہوئی تھی۔ حملے کا آغاز مجھے ہی کرنا تھا۔ سڑک بالکل سامنے تھی۔ جو نہی پہلی گاڑی میری ریج میں آئی میں نے اس پر ایک برسٹ مارا۔ میرے ساتھ حافظ منشا نشانہ لیے بیٹھے تھے، انہوں نے کلاشن کوف سے فائرنگ شروع کر دی جب کہ دو سری جانب سے سنائپر سے بھی فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔

پروگرام کے مطابق پندرہ منٹ تک فائرنگ کرنے کے بعد پسپائی اختیار کرنی تھی۔ دو دو ساتھیوں کے دو گروپ کورنگ پارٹی میں تھے۔ عقب میں چند سویلین ساتھیوں کو بٹھا دیا تھا کہ اگر فوج پیچھے کی جانب سے آئے تو وہ ہمیں سیٹی بجا کر مطلع

کریں۔ میں نے گاڑیوں پر بڑے بڑے برسٹ مارے، دوسرے ساتھیوں نے بھی
 دل کھول کر فائر کیے۔ پندرہ منٹ پورے ہونے کے بعد میں حسب منصوبہ وہاں
 سے نکل کر جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ حافظ منشا قمر بھی میرے ساتھ تھے۔ چند سو
 میٹر اوپر چڑھ کر ہم دوسرے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگے، لیکن ان کا دور دور تک
 آتا پتا نہیں تھا۔ مجھے ان کی فکر لاحق ہو گئی، اس دوران کورنگ پارٹی کا ایک مقامی
 ساتھی بھی ہم سے آ ملا، اس سے پتہ چلا کہ ہمارے ساتھی ابھی تک دشمن سے الجھے
 ہوئے ہیں۔ میں نے حافظ منشا قمر سے کہا کہ ہمیں ساتھیوں کے انتظار کے بجائے
 انہیں نکالنے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم تینوں پھر نیچے اترنے لگے۔ نیچے
 فائرنگ بے حد و حساب ہو رہی تھی اور گولیاں ہمارے ارد گرد سے گزر رہی تھیں۔
 کسی طرف سے بھی کوئی فائر آکر ہماری زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا۔ درختوں کی
 آڑ لے کر ہم سو میٹر مزید نیچے آئے اور پھر پوزیشنیں لے کر دشمن پر فائر کرنے
 لگے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور درختوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔
 بھارتی فوجی چلتے پھرتے اچھی طرح نظر آ رہے تھے، اس لیے ہمارا شاذ و نادر ہی کوئی
 نشانہ خطا جاتا تھا۔

دوسری طرف حبیب اللہ بخاری بھائی، صابر بھائی اور حمزہ سنگریا نے جب
 دیکھ کر آج تو بھارتی فوجیوں کی بہار آئی ہوئی ہے اور انہیں گاجر مولیٰ کی طرح کاٹا
 ممکن ہے تو وہ پندرہ منٹ کے وعدے کو فراموش کر گئے اور بدستور بھارتی فوجیوں کو
 گراتے رہے۔ ان کی پوزیشنیں ایسی تھیں جہاں دشمن کے گولوں اور گولیوں سے
 وہ بڑی حد تک محفوظ تھے۔ وہ ایک نہر کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، جو آگے جا کر
 ایک نالے سے ملتی تھی۔ یہ نالہ گاؤں کے درمیان سے ہو کر آتا تھا۔ اس گاؤں
 میں دریا کے کنارے ایک خوبصورت ریٹ ہاؤس تھا جہاں فوجی افسر ٹھہرے

ہوئے تھے۔ اس روز ریٹ ہاؤس میں بھی کافی چل پل تھی۔ ریٹ ہاؤس سے چند سو میٹر دور چند مکانات تھے اور باقی علاقے میں کھیت ہی کھیت تھے۔ یہ ریٹ ہاؤس بھی ان تین ساتھیوں کی رینج میں تھا۔ لگے ہاتھوں انہوں نے اس ریٹ ہاؤس کے چند افسروں کو بھی سنائپیر سے مار گرایا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اوپر سے بدستور اکا دکا فائر کر رہا تھا۔ کنگن کے فوجی کیمپ کے علاوہ دوسرے قریبی کیمپوں سے بھی فوج نے کمک منگوالی تو میں نے اپنے ساتھیوں کو نکالنے کے لیے کوشش کی۔ لڑائی کو پونا گھنٹہ ہو چکا تھا فوج کے لیے آنے والی کمک میں بڑی مارٹر گنیں بھی تھیں جو جیپوں پر نصب تھیں، اس کے علاوہ RR82 گنیں اور FPG9 گن بھی تھی جو چین والی بکتر بند گاڑیوں پر نصب تھی۔ ان گنوں نے چند منٹوں کے اندر بیسیوں گولے پھینکے۔ گاؤں کے چار بڑے مکانات دیکھتے ہی دیکھتے منہدم ہو گئے اور چار افراد شہید ہو گئے۔

دوسری طرف گاؤں کے مکینوں کا جذبہ جماد شدت پر تھا، وہ ان تینوں مجاہدوں کے پاس پہنچے اور انہیں نکلنے کا مشورہ دیا، لیکن ان کا جی ابھی نہیں بھرا تھا۔ انہوں نے گاؤں والوں کو سمجھا بچھا کرواپس بھیج دیا۔ میں اپنے ساتھیوں کے متعلق سخت پریشان تھا۔ میرے پاس وائرلیس سیٹ موجود تھا جب کہ ساتھیوں کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے ان سے رابطہ ناممکن تھا۔ میں ان کے پاس جا سکتا تھا نہ کسی ساتھی کو بھیج سکتا تھا۔ پچاس منٹ بعد خدا خدا کر کے انہوں نے نکلنے کے متعلق سوچا۔ وہ نہر کے اندر سے ہوتے ہوئے گاؤں میں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی گاؤں کے مرد اور خواتین نے ان کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جوں ہی وہ اکٹھے ہوئے۔ مارٹر کا ایک گولہ ان کے قریب آکر گرا، فضا میں دھواں چھا گیا۔ مارٹر کا ایک پارچہ حبیب اللہ بخاری کے چہرے اور سینے پر لگا اور وہ خون میں لت پت ہو کر گر پڑے۔ سب نے یہ تصور کر لیا

کہ وہ شہید ہو چکے ہیں۔ حمزہ سنگریار کو بھی گہرے زخم آئے تھے، لیکن وہ ہوش میں تھے۔ صابر بھائی صحیح سلامت تھے، انہوں نے ہوش و حواس قائم رکھے۔ فوری طور پر حبیب اللہ بھائی کی گن اور پستول اٹھایا اور حمزہ سنگریار کو لے کر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے جنگل کی طرف چل پڑے۔ ایک زخمی کے ساتھ ساتھ بہت سی گنیں اٹھانا ان کے لیے مشکل تھا۔ اس لیے حمزہ سنگریار اور حبیب اللہ بخاری کی گنیں انہوں نے جھاڑیوں میں چھپا دیں اور خود زخمی کو لے کر ہماری طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

سب سے پہلے حافظ منشا کی نظر حمزہ سنگریار اور صابر بھائی پر پڑی۔ اس نے کہا شاہین بھائی۔۔۔۔۔ ”حمزہ بھائی زخمی ہو گئے ہیں۔“ میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تو میرے دل میں جیسے تیرا تر گیا۔ حمزہ بھائی کا لباس خون سے تر تھا اور صابر بھائی کے کپڑے بھی خون آلودہ تھے۔ ہم ان کی طرف دوڑ پڑے۔ حمزہ بھائی کو سہارا دے کر گھاس پر لٹایا۔ میں ان کے زخم ٹٹولنے لگا۔ میرے پاس ایک چادر تھی، اسے پھاڑ کر زخموں پر عارضی پٹی باندھی۔ پھر میں نے مقامی ساتھی کو گاؤں کی طرف دوڑا یا کہ وہ کچھ افراد کو لے کر آئے۔ یہ جگہ غیر محفوظ تھی اور ابھی تک اکاد کا فائر آرہے تھے۔ حمزہ بھائی کو یہاں سے اوپر جنگل میں کسی محفوظ مقام پر لے جانا ناگزیر تھا۔

ہمارا ساتھی جلد ہی واپس آگیا۔ اس نے کہا کہ سارا گاؤں خالی ہے، وہاں کوئی آدم زاد نظر نہیں آرہا ہے۔ میں نے اسے دوبارہ بھیجا کہ ساتھ والے گاؤں سے جا کر چند افراد کو لے آئے۔ حمزہ بھائی اگرچہ ہوش میں تھے لیکن ان کے زخموں سے خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا۔۔۔۔۔ ”آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں، میرا وقت شہادت قریب آچکا ہے۔ میرے ساتھ کہیں آپ بھی پھنس نہ جائیں۔۔۔۔۔“ لیکن میں نے انہیں حوصلہ دیا، اور ان سے کہا۔۔۔۔۔ ”وہ یہ مت

سوچیں کہ ہم انہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے، ہم مرتے دم تک ان کی حفاظت کریں گے۔ ”حمزہ بھائی کے سینے پر گہرے زخم آئے تھے، تاہم ان کا حوصلہ جوان تھا۔ ہماری بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پانی مانگا تو ہمارے پاس پانی لانے کے لیے کوئی برتن بھی نہ تھا۔ میں قریبی ٹالے سے منہ میں پانی بھر کر لایا اور حمزہ بھائی کے منہ میں ڈال دیا، اس طرح ان کی پیاس مٹانے کی کوشش کی۔ رات بارہ بجے کشمیری مجاہد ساتھی چھ کلومیٹر دور ایک گاؤں سے چار افراد کو لے کر ہمارے پاس پہنچا۔ درمیان کے گاؤں اس جنگ کی وجہ سے خالی ہو چکے تھے۔ لوگ گھروں کو ٹالے ڈال کر چلے گئے تھے۔ ان افراد کی مدد سے حمزہ بھائی کو لے کر میں رات کے تیسرے پہر چھ کلومیٹر دور ہائٹ نامی گاؤں کے اوپر جنگل میں ایک محفوظ مقام پر پہنچا۔ حمزہ بھائی ہوش میں تھے لیکن ان کے زخموں سے خون ابھی تک رس رہا تھا، دوسری طرف فوج نے رات بھر فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ تاہم اس نے گاؤں میں داخل ہونے کی جرات نہیں کی، حالانکہ وہاں نہ ہم تھے اور نہ ہی گھروں کے مکین۔

علی الصباح میں خود نیچے گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔ پیکاگن میرے کندھے پر تھی۔ فوجیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ انہوں نے مجھے اور میں نے انہیں دیکھا۔ وہ مجھے اچھی طرح پہچان بھی گئے تھے، لیکن مجھ سے نظریں ملائے بغیر گزر جاتے تھے۔ میں سڑک پر چلتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ وہاں سے ایک چارپائی اور دس افراد کو ساتھ لیا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ فوج نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن روکنے کی ہمت نہیں کی۔ گاؤں آنے سے قبل میں نے ایک ساتھی کو ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ ڈاکٹر اور ادویات وغیرہ لے کر آ سکے۔ مقامی ہسپتال کی فوج نے ناکہ بندی کی ہوئی تھی اور ڈاکٹروں کو اندر جانے کی اجازت

نہیں تھی، تاہم اس موقع پر ایک ڈاکٹر نے کمال جرات سے کام لیا اور فوج کی
 آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے ہسپتال میں کھڑکی کے ذریعے داخل ہو گئے اور
 تمام ضروری ادویات وغیرہ لا کر ہمارے ساتھی کو دے دیں۔ مقامی افراد نے اکیال
 کی ڈپنسری کو توڑ کر بھی کافی مقدار میں ادویات وغیرہ نکال لی تھیں۔ حمزہ بھائی کے
 زخمی ہونے کی اطلاع سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔
 ہمارے مقامی ساتھی کو وہاں دیکھ کر خواتین بھی جمع ہو گئیں۔ ان میں دختران ملت
 اور بنات الاسلام کی چند ورکر بھی تھیں جو ابتدائی طبی کام بھی جانتی تھیں۔ مرہم
 پٹی کرنے کے لیے دو خواتین نے خود کو پیش کر دیا۔ انہوں نے پھٹے پرانے کپڑے
 اور جوتے پہنے، دیہات میں کام کرنے والی عورتوں کا روپ دھارا، برقعوں کے نیچے
 ادویات وغیرہ کو چھپایا اور طویل راستے سے جنگل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ ہمارا
 کشمیری ساتھی ان کے ساتھ تھا۔ ایک گھنٹے کی سخت چڑھائی کے بعد ہماری یہ
 کشمیری بہنیں زخمی کے پاس پہنچ گئیں۔ حمزہ بھائی کو ہم نے جنگل میں ایک محفوظ
 مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ ان دونوں نے اس کے زخم دھو کر مرہم پٹی کی۔ وہ اپنے
 ساتھ ڈرپ بھی لے کر آئی تھیں۔ انہوں نے حمزہ بھائی کو باقاعدہ ڈرپ لگائی۔ اس
 طرح جنگل کا یہ ویران مقام عارضی طور پر ایک چھوٹا سا ہسپتال دکھائی دینے لگا۔
 کشمیری بہنوں کی اپنے بھائی کے لیے محبت اور عقیدت کے اس جذبے نے ہمیں
 کتنا متاثر کیا، بیان سے باہر ہے۔ انہوں نے جس بہادری سے بھارتی فوج کے
 زبردست گھیرے کے باوجود جانوں کو خطرے میں ڈال کر جنگل کے اس دور افتادہ
 مقام پر آنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ قرون اولیٰ کی مسلمان خواتین کے کردار کی عکاسی
 کرتا تھا۔

حمزہ سنگریار کی طرف سے قدرے مطمئن ہوئے تو میں نے صابر بھائی سے کہا،

نیچے گاؤں میں جاتے ہیں تاکہ حبیب اللہ بھائی کی تجہیز و تکفین کے متعلق معلوم کر لیا جائے۔ گنیں وغیرہ بھی لانا ضروری تھا، کیوں کہ وہاں سے انہیں کوئی بھی اٹھا سکتا تھا۔ مغرب کے بعد ہم دونوں گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے گنوں کو اپنے قبضے میں لیا، اس کے بعد اس جگہ گئے جہاں ہمارا ساتھی شہید ہوا تھا۔ وہاں خون آلود مٹی تو نظر آرہی تھی لیکن ہمارا شہید ساتھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر گھروں سے چند افراد باہر نکل آئے۔ ان سے اپنے شہید ساتھی کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قریبی گاؤں کے ایک گھر میں ہے اور شہید نہیں ہوا بلکہ شدید زخمی ہے۔ یہ سن کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی۔ اس گاؤں کے ارد گرد ابھی تک فوج کی غیر معمولی تعداد تھی، اس لیے فوری طور پر ہمارا وہاں جانا ممکن نہیں تھا۔

حبیب اللہ بخاری کو ایک گھر میں مقامی زخمی کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ وہ محفوظ ہاتھوں میں تھے۔ اس کے بعد میں اور صابر بھائی واپس جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم نے اس دوران مختلف اطراف میں موجود مجاہدین کو بھی وائرلیس سیٹ کے ذریعے اس علاقے میں آنے کا پیغام دے دیا تھا۔ چنانچہ عبدالرحمان بھائی کی قیادت میں چند پاکستانی مجاہد اور مقامی کمپنی کمانڈر کی معیت میں پندرہ بیس مقامی مجاہدین بھی ہمارے پاس آ پہنچے۔ جنگ ابھی جاری تھی اور علاقے میں دور تک پھیل چکی تھی۔ ہمارے ساتھی ابھی تک فوج پر فائرنگ کر رہے تھے۔

فوج کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے حبیب اللہ بخاری کو اگلی رات اس کے میزبانوں نے جنگل میں لا کر چھوڑ دیا۔ مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے ان کے زخم بگڑ گئے تھے۔ ان کے پاس صرف ایک کمبل رکھ دیا گیا، ہمیں ان کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ شدید سردی اور زخمی حالت میں ہمارے ساتھی کو وہاں زندگی کا

حیرت انگیز تجربہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے غیب سے ان کی مدد فرمائی اور گھنے جنگل میں کہیں سے ایک شیر اس طرف آنکلا۔ اس نے ایک انسان کو زخموں سے چور دیکھا تو اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حبیب اللہ بخاری بھائی نے آنکھیں کھول کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا تو درندے کی آنکھوں میں ہمدردی اور محبت کی روشنی دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ اس کے بعد حبیب اللہ بھائی نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ شیر نے زخمی کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا گوارا نہیں کیا اور زخمی کے ساتھ لیٹ کر لیٹ گیا۔ اس طرح یہ سخت اور سرد رات حبیب اللہ بخاری نے شیر کے ساتھ لیٹ کر گزار دی۔ زخموں کی وجہ سے نیند تو ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، تاہم وہ سردی سے محفوظ رہے۔ ہم حبیب اللہ بخاری کے ساتھ پیش آنے والی اس ساری صورت حال سے بے خبر تھے۔ ہمیں گاؤں کے افراد نے بتایا بھی نہیں کہ زخمی کو ہم مجبور ہو کر جنگل میں چھوڑ آئے ہیں۔

مجھے اگلی صبح یہ معلوم ہوا کہ حبیب اللہ بھائی شدید زخمی ہیں اور جنگل کے فلاں مقام پر بے یار و مددگار پڑے ہیں۔ بے حد غم زدہ ہو کر میں نے ان کی طرف دوڑ لگا دی۔ ایک گھنٹے کے بعد میں حبیب اللہ بھائی کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت ہوش میں آچکے تھے اور چند مقامی افراد ان کے ارد گرد کھڑے تھے۔ یہ وہی افراد تھے جنہوں نے رات کو انہیں وہاں لا کر چھوڑا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ علی الصبح وہ ان کو دیکھنے آئے تو شیر ان کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ جوں ہی شیر کی نظر ان پر پڑی وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے فوری طور پر ایک گھوڑا منگوا یا اور حبیب اللہ بخاری کو اس پر بٹھا کر حمزہ سگریار کے پاس لے گئے۔ اب اس ”ہسپتال“ میں دو زخمی تھے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر خواتین بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے سپرٹ سے حبیب اللہ بخاری کے زخم دھو کر مرہم پٹی کی۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایک آرام دہ بستر

پر چشمے کے کنارے لٹا دیا۔ گزشتہ ایک دن سے ان کے زخموں پر ایک پھاہا تک نہیں رکھا گیا تھا جس کی وجہ سے زخم خراب ہو گئے تھے۔ زخمیوں کو ابتدائی طبی امداد تو مل گئی تھی، لیکن یہ کافی نہ تھا۔ میں دونوں زخمیوں کے بارے میں بہت پریشان تھا۔ خصوصاً "حبیب اللہ بخاری کی حالت نازک تھی۔ اس دور دراز جنگل میں ان کا مناسب علاج کروانا ناممکن تھا۔ اس دوران میرے ذہن میں اچانک ایک سرجن کا خیال آیا۔ یہ سرجن میرے گہرے دوست تھے اور سری نگر میں کام کرتے تھے۔ میں نے فوراً ایک ساتھی کو ان کے نام خط دیا اور کہا کہ وہ ادویات سمیت فوراً یہاں پہنچ جائیں۔ میں نے خط میں اور زبانی زخمیوں کی حالت بھی بیان کر دی تھی۔

اس دوران فوج نے گاندر بل تک پورے علاقے کا زبردست محاصرہ کر رکھا تھا۔ میں حافظ منشا قمر کے ہمراہ سارا دن نالہ سندھ پر بنے ہوئے پلوں پر ڈیوٹی دیتا رہا تاکہ فوج ہمارے زخمیوں کی طرف نہ آ سکے۔ اس دوران متعدد بار فوج نے پل عبور کر کے ہماری طرف آنے کی کوشش کی لیکن ہماری جوانی کارروائی نے اسے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کارروائی کے دوران بہت سے فوجی ہماری گولیوں کی نذر ہوئے۔

اگلے روز سری نگر سے ہمارے سرجن دوست جنگل میں پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک طویل پیدل سفر طے کیا تھا۔ ان کی مجاہدین سے محبت اور جرات تھی کہ وہ اتنی دور آ پہنچے۔ انہوں نے زخمیوں کی حالت دیکھ کر انہیں فوراً سری نگر پہنچانے کا مشورہ دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ کنگن سے سری نگر تک قدم قدم پر فوج اور اس کے مخبر موجود تھی۔ اور پھر صورہ سمیت سری نگر میں فوجی بٹکر "مشروم" کی طرح اگے ہوئے تھے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے اوپر سے زخمیوں کو لے جانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، لیکن میں نے "جوئے شیر" لانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے

ساتھیوں کو اس طرح بے بسی کی حالت میں شہید ہوتے دیکھنا میرے لیے سوہان روح تھا۔ چنانچہ میں نے دو اسٹریچر بنوائے، ان پر زخمیوں کو لٹایا، میں کے قریب مقامی مجاہدین کو صابر بھائی اور عبدالرحمان بھائی کے ہمراہ میں نے سری نگر روانہ کر دیا۔

مجھے فوج کو جنگل کی طرف آنے سے روکنے کے لیے وہیں رکنا تھا۔ سری نگر میں اپنے ہمدردوں اور تنظیم کے عہدیداروں کو میں نے وائرلیس کے ذریعے صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور انہیں زخمیوں کی آمد کے متعلق بھی بتا دیا تھا، تاکہ وہ وہاں انتظامات کر سکیں۔ میرے یہ ساتھی زخمیوں کو اٹھائے کنگن کے چودہ ہزار فٹ بلند پہاڑ کو عبور کر کے کھنبر کی طرف سے چار دن کے سفر کے بعد سری نگر پہنچے۔ فوج کو علم ہو گیا تھا کہ مجاہدین زخمی ہیں، اس لیے انہوں نے کنگن کے ہسپتالوں کا خصوصی طور سے گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ لیکن بھارتی فوج اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ زخمی ان سے کوسوں دور پہنچ چکے ہیں۔ چار دن تک کنگن کا کریک ڈاؤن جاری رہا۔ اس دوران عوام نے متعدد بار فوج سے کہا کہ وہ جنگل میں اپنے زخمی مجاہدین کو دیکھنے اور ان کے علاج معالجے کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ فوجی انہیں اس کی اجازت کہاں دیتے، تاہم فوج نے ایک چال چلنے کی کوشش کی اور عوام سے کہا وہ مجاہدین کو ان کے حوالے کر دیں تو ان کا علاج معالجہ کرایا جائے گا اور پھر انہیں واپس بھی کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے بھارتی فوج کے ان وعدوں کا اعتبار کون کر سکتا تھا۔ جنگل میں اب میں اور حافظ منشا قمر رہ گئے۔ زخمیوں کو سری نگر روانہ کرنے کے بعد ان کی خیریت کے بارے میں دل میں طرح طرح کے خیالات گردش کرتے رہے۔ ہم دونوں بو جھل قدموں کے ساتھ جنگل میں پھرتے رہتے تھے۔ پھر ایک روز ہم نے باہمی مشورے سے جنگل کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ عصر

کے بعد اپنے ٹھکانے سے روانہ ہوئے، راستے میں ایک چشے کے کنارے مغرب کی نماز ادا کی اور اپنے ساتھیوں کی صحت اور خیریت کے لیے رب دو جہاں کے حضور دعائیں مانگیں۔ ہمارا یہاں سے جلد از جلد نکل جانا ضروری تھا اس لیے کہ بھارتی فوج نے آج نہیں تو کل اس جنگل میں داخل ہونا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ فضائی امداد بھی حاصل کرے۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نیچے نالہ سندھ کے کنارے پہنچے۔ پل پر فوجیوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ رات آٹھ بجے ہم نے پل عبور کیا اور فوج کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ دریا کے کنارے ایک نہر کی تعمیر کا کام جاری تھا۔ ہم اس زیر تعمیر نہر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گاؤں پہنچ گئے۔ گاؤں میں الو بول رہے تھے۔ فوج کے خوف کی وجہ سے لوگ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

ہم نے رات ایک خالی گھر میں گزاری۔ نماز فجر کے لیے بیدار ہوا، کھڑکی سے جھانک کر میں نے دیکھا تو ہزاروں کی تعداد میں فوجی سامنے جنگل میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کی مدد کے لیے پل کے اس طرف مارٹر گنیں، توپیں، اور مشین گنیں نصب تھیں۔ فوجیوں کے ہمراہ بو سو نگھنے والے کتے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ فوجی ہماری تلاش میں کتوں کی مدد سے اس مقام تک جا پہنچے تھے، جہاں ہم نے اپنے زخمیوں کے لیے ایک چھوٹا سا ہسپتال بنا رکھا تھا، لیکن انہیں ہم ملے نہ زخمی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم تھا کہ ہم اسی رات کو پل عبور کر کے آ گئے تھے بصورت دیگر ہزاروں فوجیوں سے لڑنا ہمارے لیے بہت مشکل ہوتا۔ فوج صبح سے شام تک ہماری تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی۔

ہم نے گھر میں کھانے پینے کے لیے کچھ تلاش کر لیا، فوج کی ساری توجہ سامنے کی طرف تھی، ہم نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور پشت کے پہاڑ کی طرف نکل

گئے۔ ہمارے لیے فوج پر حملہ کرنے کا ایک اچھا موقع پیدا ہو گیا تھا، جسے ہم کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ہم دونوں نے پہاڑ پر ایک ایسا مقام تلاش کیا، جہاں سے نالہ سندھ کے دونوں پل اچھی طرح ہمارا نشانہ بن سکتے تھے۔ کنگن شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر یہ جگہ کنگن پل اور ٹنگ چھتر پل کے وسط میں واقع تھی۔ ہم یہاں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شام کے وقت فوج جب واپس آئے گی تو اس کو نشانہ بنائیں گے۔

دن بھر ہم گھات لگا کر دشمن کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ ہم اچھی طرح محفوظ تھے اور دشمن ہماری اس جگہ موجودگی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ ہمارے سامنے تین سو میٹر دور نالہ سندھ پر لکڑی کے دونوں نرم و نازک پانچ فٹ چوڑے اور ڈیڑھ سو فٹ طویل پل رسوں کے سہارے جھول رہے تھے۔ ان پر چند پیدل افراد کے اکٹھے گزرنے کی بمشکل گنجائش تھی، گاڑی کا گزر ممکن نہ تھا۔ گزشتہ رات ہم ان پلوں کو عبور کر کے آئے تھے۔ اب صبح سے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انتظار بھی جہاد کا لازمی حصہ ہے۔ ہمیں طویل انتظار کرنا پڑا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا کہ ہماری امید بر آئی۔ فوجی سارا دن ہماری تلاش میں جنگل کی خاک چھان کر، ناکامی کی دھول چروں پر لیے واپس آتے دکھائی دیے تو ہمارے چروں پر رونق آگئی۔ ہم ان کے بھرپور ”استقبال“ کے لیے بالکل تیار تھے۔ میں اور حافظ منشا قمر دونوں ان کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ ہماری انگلیاں گتوں کے ٹرائیگرز پر تھیں۔ دن بھر کے تھکے ہارے فوجیوں کو اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر لمبے لمبے ڈگ بھرتے لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب آتے جا رہے تھے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم لمحے گنتے لگے۔۔۔ ایک

.....دو..... تین۔۔۔۔۔ فوجی گزرنے لگے۔ دونوں پلوں سے تقریباً پچاس پچاس فوجی باری باری گزر چکے تو باقی راستہ صاف دیکھ کر بھیڑ کی صورت میں پلوں پر چڑھ گئے۔ ہم اس لمحے کے منتظر تھے۔ میں نے پیکا گن سے ایک پل کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اگلے لمحے حافظ منشا قمر نے اپنی سنائپنگ گن سے دوسرے پل پر ایک فوجی کو نشانہ بنایا۔ جوں ہی دو فوجی گرے، پلوں پر موجود فوجیوں میں ہڑبونگ مچ گئی۔ اب میں مزید گولیاں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ بے پناہ ہڑبونگ اور بدحواسی کا قابل دید نظارہ شروع ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے فوجی پل پر پوزیشن لینے سے تو رہے۔ ہمارا حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ ان کو کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ وہ سارے پل کے رسوں سے چمٹ گئے اور اپنے آپ کو آگے جھکا کر بزم خود آڑ لینے کی کوشش کرنے لگے۔ پلوں کے بوسیدہ رے یہ وزن اٹھانے کے قابل نہ تھے۔۔۔۔۔ پلوں پر دیکھتے ہی دیکھتے گویا ایک بھونچال سا آگیا۔ پل پہلے الٹے اور پھر ٹوٹ گئے۔ اور فوجی دونوں پلوں سے چھپاک چھپاک کرتے نالہ سندھ میں گرنے لگے اور بخ بستہ پانی سے تیر کر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ان میں سے کتنے باہر آنے میں کامیاب ہوئے اور کتنے لہروں کی نذر ہو گئے.... کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان دنوں پہاڑوں پر برف پکھلنا شروع ہو چکی تھی اور نالہ سندھ میں طغیانی کا منظر تھا۔ بہت اچھا اور تجربہ کار تیراک ہی اسے عبور کر سکتا تھا۔ لیکن جب بخ بستہ پانی میں گرنے سے اعضاء شل ہو جائیں تو تیراکی کا تجربہ بھی کسی کام نہیں آتا۔

ان پلوں کو عبور کرنے کے بعد بھی چھوٹے چھوٹے دوپل تھے ان کو بھی عبور کرنا تھا، اب صورت حال یہ تھی کہ تقریباً ایک سو فوجی جو پلوں سے گزر چکے تھے اور ندی کے دوسرے پاٹ کے چھوٹے پلوں کے قریب تھے، ان کے پیچھے فوجیوں کی ایک بڑی تعداد نالے میں زندگی بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

جبکہ سینکڑوں فوجی ابھی نالے کے اس پار کھڑے تھے۔ ہم نے چند فائر کیے تو دونوں طرف کے فوجیوں نے ندی کے آر پار پوزیشنیں لے لیں۔ جو فوجی پل عبور کر چکے تھے انہوں نے سمجھا مجاہدین نے عقب میں سے پہاڑ کی طرف سے فائرنگ کی ہے۔ اس طرح وہ اس طرف فائر کرنے لگے جہاں ان کے اپنے ساتھی کھڑے تھے۔

دوسری طرف وہ فوجی جنہوں نے ابھی تک پل عبور نہیں کیا تھا انہوں نے یہ تصور کر لیا کہ ان کے وہ ساتھی جو پل عبور کر چکے ہیں، مجاہدین کے اچانک حملے کی زد میں آ گئے ہیں، چنانچہ وہ ہماری طرف فائرنگ کرنے لگے۔ ہم دونوں نے محض سات فائر کیے تھے اور اب خاموشی سے ان کی بدحواسی کا تماشا کر رہے تھے۔ دونوں طرف کے فوجی شام کے پھلتے اندھیرے میں ایک دوسرے کے خلاف پوزیشنیں لیے اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ سرمئی شام رات کی تاریکی میں بدل گئی تو فائرنگ کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ ہم نے ان کو باقاعدہ پلان کے تحت ٹریپ کیا تھا اور وہ دھوکے میں آ کر اپنے ہی ساتھیوں کو دشمن سمجھ کر نشانہ بنا رہے تھے۔ بیک وقت سینکڑوں گنیں آگ گل رہی تھیں اور شور سے کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

کوئی آدھ گھنٹہ تک ہم اس جھڑپ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اب ہمارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے حافظ منشا قمر سے کہا کہ اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں، اس لیے نکلنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں نے پیکا کنڈھے پر رکھی، حافظ صاحب نے اپنی سنائپنگ گن سنبھالی اور ہم عقب کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہم نے ٹارچ کی مدد سے سفر جاری رکھا۔ کوئی پانچ سو میٹر اوپر چڑھنے کے بعد ہم ایک سیدھی پگڈنڈی پر ہو لیے۔ یہ راستہ کاوانا نامی گاؤں کو جاتا تھا۔

رات دس بجے کے قریب ہم اس گاؤں میں مجاہدین کے ایک ہمدرد کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے ہمارے کھانا پینے کا بندوبست کیا۔ دن بھر کی مشقت کی وجہ سے سخت بھوک لگ رہی تھی، سیر ہو کر کھانا کھایا، پھر چائے پی۔ ہمارے میزبان کا اصرار تھا کہ رات ان کے ہاں بسر کی جائے، لیکن اس میں ہمارے لیے بھی خطرہ تھا اور ہمارے میزبان کے لیے بھی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس لیے میں نے ان کی پیش کش پر معذرت کر لی اور ان سے عاریتا "دو کمبل مہیا کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے بخوشی دو گرم کمبل دے دیے جنہیں ہم بغل میں دبائے ایک بار پھر جنگل میں پہنچے۔ رات بارہ بجے ہم نے جنگل میں ایک بڑے درخت کے نیچے اپنے بستر بچھائے۔ سرہانے کی جگہ اپنی گتیں رکھیں اور گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح میری آنکھ کھلی تو پانچ بج رہے تھے۔ ابھی سورج نکلنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ حافظ صاحب کو جگایا اور دونوں نے قریبی چشمے پر جا کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر ہم دوبارہ کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً اٹھا اور قریب ہی ایک بلند مقام پر جا کر دیکھا کہ ایک فوجی ہیلی کاپٹر نالہ سندھ کے اوپر نیچی پرواز کر رہا تھا۔ میں نے حافظ منشا قمر کو آواز دی۔ ہیلی کاپٹر مزید نیچے آرہا تھا اور ہم دونوں بڑی محویت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہیلی کاپٹر نے رے لٹکائے۔ نیچے ندی سے کچھ فوجی ان رسوں سے لٹک گئے۔ ہیلی کاپٹر انہیں لے کر کسی محفوظ مقام کی طرف اڑنے لگا۔ یہ وہ فوجی تھے جو پل الٹنے کی وجہ سے ندی کی نذر ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو غرق ہو گئے، جبکہ کچھ باہر نکل گئے تھے۔۔۔ اور چند ایک نے نالہ سندھ کے چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں میں پناہ لے لی تھی۔ وہ فائرنگ اور پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ

سے ساری رات وہیں پڑے سردی اور خوف سے کانپتے رہے اور علی الصباح ہیلی کاپٹر کے ذریعے وہاں سے نکالے گئے۔ تاہم ان کی تعداد مٹھی بھر تھی۔ فوج نے اس روز از سر نو سندھ ندی پر ایک عارضی پل تعمیر کر کے اپنی باقی ماندہ نفری کو اس پار اتارا۔

یہ دن ہم نے جنگل میں ہی گزار دیا۔ ہمارے ہمدرد ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان ہمارے ٹھکانے پر ہی لے آئے تھے۔ جب وہ کھانا لے کر آتے، تو ان سے کافی دیر تک گپ شپ رہتی۔ وہ ہماری کارروائی پر بے حد خوش تھے۔ اگلے دن ایک ہمدرد تازہ اخبار لے آیا۔ اس میں ہماری کارروائی کی تفصیلات شائع ہوئی تھیں۔ اخباری اطلاع کے مطابق ایک کیپٹن سمیت بیس فوجی اس حملے میں مارے گئے تھے، لیکن اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی جو اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ پہلی جھڑپ جس میں حمزہ سنگریا اور حبیب اللہ بخاری زخمی ہوئے تھے، اخباری اطلاع کے مطابق اس میں پچاس فوجی ہلاک ہوئے تھے۔ اس جھڑپ کی تفصیلات چند دن تک قسطوں میں شائع ہوتی رہیں۔

مقامی افراد کا کہنا تھا کہ فوج نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو نالہ سندھ میں پھینک دیا تھا اس لیے کہ اتنی بڑی تعداد میں لاشوں کو سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر اتنے زیادہ جانی نقصان کی تشہیر سے دوسرے فوجیوں کا مورال بھی گر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آسان راہ تلاش کر کے انہیں نالہ سندھ کے حوالے کر دیا۔ لیکن جس طرح فوجی حکام چاہتے تھے اس طرح ہوا نہیں۔ چند دن تک تو یہ لاشیں نالہ سندھ کے پیٹ میں چھپی رہیں، لیکن پھر اس نے اگلنا شروع کر دیں۔ اب کوئی لاش کسی پل کے نیچے سے برآمد ہو رہی تھی، تو کسی نے کسی پتھر کے پیچھے سے یا ریت میں سے منہ نکالا ہوا تھا۔ مقامی لوگ نالہ سندھ سے لکڑیاں پکڑنے جاتے تو ان کے ہاتھ بھی

لاشیں آ جاتیں۔ بیس دن تک یہ سلسلہ جاری رہا اور درجنوں لاشیں دریا کے کنارے پڑی ہوئی ملیں اور یہ خبر سینہ بہ سینہ کنگن کے علاقے سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی۔ اور بالاخر اخبارات نے خبر شائع کر کے وہ راز افشا کر دیا جس کو بھارتی فوجی حکام چھپانا چاہتے تھے۔ اس سے بھارتی فوج کی اتنی رسوائی ہوئی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

یہ تو تھی میری اور حافظ منشا قمر کی روداد.....

دوسری طرف صابر بھائی مقامی مجاہدین کے ہمراہ دونوں زخمیوں کو لے کر کنگن کے بلند و بالا پہاڑ کو عبور کر کے سری نگر کی طرف ایک گاؤں میں خیریت سے اتر گئے تھے۔ وہاں انہوں نے زخمی ساتھیوں کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑا اور پھر مقامی نظم کے تعاون سے رات کے وقت انتہائی رازداری سے انہیں سری نگر کے ایک ہسپتال کی طرف لے کر روانہ ہو گئے۔ ہسپتال کے دروازوں پر فوج کے بکرتھے۔ ان بکروں سے ہو کر ہسپتال میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چنانچہ ساتھیوں نے باہمی مشورے سے ہسپتال کے عقب سے دونوں زخمیوں کو ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے شکاف میں سے اندر پہنچا دیا۔

مجاہدین نے دونوں زخمیوں کے لمبے لمبے بال کاٹ کر اور شیو وغیرہ کر کے حلیہ کافی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ انہوں نے دونوں زخمیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دو گھنٹے کے اندر اندر علاج مکمل کر کے انہیں مجاہدین کے حوالے کر دیا۔ رات کے تیسرے پہر دونوں زخمیوں کو لے کر مجاہدین ہسپتال کے عقبی راستے سے باہر نکلے اور کار میں سوار کر کے انہیں سری نگر میں ہی ایک محفوظ گھر میں پہنچا دیا۔ حمزہ سنگریا دو ماہ بعد ٹھیک ہوئے اور ہم سے دوبارہ آ ملے تھے۔ حبیب اللہ بخاری کے زخم بھی بڑی تیزی سے مندمل ہو رہے تھے۔ ان

کے چہرے کا زخم بھی کافی حد تک ٹھیک ہو گیا لیکن ان کے کان کا زخم انفیکشن ہو جانے کی وجہ سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں مزید کچھ عرصے تک سری نگر میں رہنا پڑا۔

اب کنگن میں ہم دو ساتھی رہ گئے تھے۔ چند دن بعد کچھ مقامی مجاہدین بھی ہم سے آ ملے۔ پاکستانی مجاہدین نے کنگن کے پہاڑوں کی دوسری طرف سری نگر کے مضافات کو اپنی سرگرمیوں کے لیے چن لیا تھا۔ میرا ان سے وائرلیس سیٹ کے ذریعے رابطہ تھا۔ میں نے ہی انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ کنگن نہ آئیں، کیونکہ گزشتہ جھڑپوں کے بعد کنگن کے علاقے میں بے شمار نئے بکر قائم کر دیئے گئے تھے اور فوج ہماری تلاش میں جنگلوں کو بھی چھان رہی تھی اور قریبی دیہات میں جگہ جگہ صبح سے شام تک ڈیرے ڈالے رکھتی تھی۔ میں اور حافظ منشا قمر نے پہاڑ کی چوٹی پر ایک ایسی جگہ آشیانہ بنا رکھا تھا جہاں فوج ہمارا سراغ نہیں پاسکتی تھی۔ ہمارے پاس بستر تھے اس کے علاوہ کھانے پینے کے لیے خشک فروٹ بھی تھا۔ کچھ دن تک ہم نے اس پر گزارا کیا، اس کے بعد مقامی ہمدردوں نے جان پر کھیل کر ہمیں کھانا پہنچانا شروع کر دیا۔ وائرلیس کے ذریعے میرا رابطہ وادی میں مجاہدین سے قائم تھا۔ میں نے ان کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ رکھا ہوا تھا اور ان کے مشاغل سے میں آگاہ رہتا تھا۔ موسم سرما اپنی تلخ بستہ ہواؤں سمیت رخصت ہو چکا تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی، ہمارے ٹھکانے کے آس پاس اور جنگل میں دور دور تک جنگلی پھول کھلے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ پہاڑوں نے بھی سبز لباس زیب تن کر لیا تھا۔ برف پکھلنا شروع ہو گئی تھی اور پانی کی چھوٹی چھوٹی ندیاں کنگن کے پہاڑوں کے سینے پر بل کھاتی ہوئی نالہ سندھ کی طرف رواں تھیں۔

ایک دن حافظ صاحب کے ہمراہ ناشتہ وغیرہ کر کے میں پہاڑ کی چوٹی پر ایک پتھر

پر بیٹھا ہوا تھا۔ موسم بہار کی اجلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں ہمارے جسموں کو چوم رہی تھیں اور ان کی حرارت ہم اپنی روح تک اترتی محسوس کر رہے تھے۔ اس دوران ایک ہمدرد ایک خط لیے ہمارے پاس آپہنچا۔ خط حمزہ سنگریار نے بھیجا تھا۔ حمزہ بھائی نے اپنی خیر خیریت لکھی تھی اور ہمیں تاکید کی تھی کہ فوج کے خلاف کارروائیوں میں ضعف نہیں آنا چاہیے۔ حمزہ بھائی نے مشورہ دیا تھا کہ سکواڈ کو از سر نو منظم کر کے دوبارہ سے بھارتی فوج کے خلاف کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ہمارا سکواڈ گزشتہ واقعات کے بعد تتر بتر ہو گیا تھا، اس لیے دوبارہ سے سکواڈ تشکیل دینا ناممکن تھا۔ تاہم ہم دو بھی حمزہ بھائی کی فرمائش کے مطابق بھارتی فوج کے منہ کا ڈانقہ کڑوا کر سکتے تھے۔ کچھ دن تو ہم پہاڑ پر رہے اور اس کی قریبی آبادیوں تک ہی آنا جانا رہا۔ اس کے بعد ہم نے کنگن کے مختلف گاؤں میں بھی آنا جانا شروع کر دیا۔

ایک دن عصر کے وقت میں اور حافظ صاحب کاوا سے کاوا چیرن جا رہے تھے۔ بستی کے قریب پہنچے، دیکھا تو ایک کمرے سے بہت سے لوگ نکلتے دکھائی دیے۔ میں نے ایک شخص کو روک کر پوچھا ماجر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ایک فلم دیکھ رہے تھے جس میں بھارتی فوج اور مجاہدین کے درمیان جنگ کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ مجھے بھی تجسّس ہوا دیکھوں کیسی فلم ہے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے، فلم بینوں نے ہمیں دیکھا تو احترام میں کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر فلم کے چند سٹائٹس دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ بھارتی حکام نے خاص طور سے مجاہدین کشمیر کو بدنام کرنے کے لیے یہ فلم تیار کی ہے۔ فلم کا ایک منظر یہ تھا کہ صرف دو فوجیوں نے درجنوں مجاہدین کے خلاف کمانڈو ایکشن کر کے انہیں شہید کر دیا۔ اس کے علاوہ فلم میں مجاہدین کو کم ہمت، بزدل اور ظالم دکھایا گیا تھا۔ فلم کا نام ”اگر وادی“ تھا۔

بھارت اس کے ذریعے کشمیری عوام میں مجاہدین کے خلاف نفرت کا زہر پھیلاتا چاہتا تھا۔ میں نے قلم دیکھی تو غصے سے تلملا اٹھا۔ میں نے فوراً قلم بند کرنے کا حکم دیا اور کہا آئندہ کوئی یہ قلم نہیں دیکھے گا۔ میں نے اس جگہ اعلان کیا، یہ سب جھوٹا پروپیگنڈہ ہے، آپ کل اسی وقت مجاہدین کی اصل تصویر دیکھیں گے جو اس قلم کے بالکل برعکس ہوگی۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے بزدل کون ہے اور بہادر کون.....؟ یہ اعلان کرنے کے بعد ہم کاواچیرن میں اپنے ایک دوست کے ہاں چلے گئے۔ وہاں چائے پی اور حسب معمول قریبی جنگل میں شب ب سری کے لیے چلے گئے۔

علی الصبح نماز ادا کرنے کے بعد نیچے گاؤں میں جا کر ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد ہم قریبی گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم دشمن پر ایک بڑا حملہ کر کے اس کے پروپیگنڈے کے اثرات زائل کر دینا چاہتے تھے۔ یہ سفر اسی حملے کی تیاری کے سلسلے میں تھا۔ بھارتی فوج کا تقریباً دو سو گاڑیوں کا قافلہ ہفتے میں ایک آدھ دن چھوڑ کر سری نگر سے لداخ اور لداخ سے سری نگر جانے کے لیے یہاں سے گزرتا تھا۔ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ سہ پہر چار بجے کے قریب یہاں سے گزرے گا۔ قافلے کی آمد کا اندازہ فوجیوں کی غیر معمولی نقل و حرکت اور حفاظتی اقدامات سے بھی ہو گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے گاؤں میں ہی ایک شخص کے ہاں کھایا۔ اس کے بعد میں حافظ صاحب کے ہمراہ ٹنگ چھتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹنگ چھتر سے آدھ کلومیٹر پہلے میں نے حافظ صاحب کو سری نگر لداخ ہائی وے کے سامنے پانچ سو میٹر کی بلندی پر ایک محفوظ مقام پر گھات لگانے کے لیے بٹھا دیا۔ انہیں میں نے اپنی پیکاگن دے دی اور ان سے کلاشن کوف لے لی۔ حافظ صاحب نے روشنی کے گولے بھی فائر کرنے کے لیے ساتھ رکھ لیے۔ حافظ صاحب کو وہاں چھوڑ کر میں

دھان کے ایک کھیت میں چلا گیا۔ یہ دھان کاشت کرنے کے دن تھے اور کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ میں اس وقت بھارتی فوج کی وردی میں ملبوس تھا۔ اپنے آپ کو مزید کیمو فلاج کرنے کے لیے میں نے ساری وردی پر کیچڑ سے لپائی کی اور پھر سیمنٹ کے ایک تھیلے کو پھاڑ کر اس کی ٹوپی بنا کر سر پر رکھ لی۔ چہرے پر بھی کیچڑ مل لیا، اپنی گن پر بھی خاکی رنگ کا کپڑا لپیٹ لیا۔ اب میں سرتاپا ”خاکی“ تھا۔ اس کے بعد میں شالی کے کھیتوں کے درمیان سے کرائنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

نالہ سندھ کے بالکل ساتھ ایک دیوار بنی ہوئی تھی اور اس دیوار کے اوپر سڑک تھی۔ دیوار کا کچھ حصہ سڑک کے اوپر بھی تھا۔ سڑک کی دوسری جانب ایک تمیں گز اونچی ٹیکری تھی۔ اس ٹیکری کے دامن میں بھارتی فوج کی چند گاڑیاں کھڑی تھیں اور ٹیکری پر بیس پیچیس فوجی پہرہ دے رہے تھے۔ جس روز فوجی قافلے نے گزرنا ہوتا تھا اس روز فوجی ساری سڑک پر پھیلا دیے جاتے تھے۔ میں کامیابی سے کھیتوں کے درمیان سے رینگتا ہوا ان فوجیوں سے سو گز کے فاصلے پر دریا کے پار ایک پتھر کی اوٹ میں پہنچ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھ سے تقریباً تمیں گز کے فاصلے پر دائیں طرف ایک چشمہ تھا جہاں گاؤں کی عورتیں برتن دھونے اور پانی لے جانے کے لیے سارا دن آتی جاتی رہتی تھیں۔ چشمے اور فوجیوں کی ٹیکری کے درمیان اگرچہ سو میٹر سے زیادہ فاصلہ تھا لیکن دونوں مقامات ایک دوسرے کے بالکل سامنے تھے۔ اس وقت بھی چشمے پر خواتین موجود تھیں۔ فوجی ان خواتین کو فحش اشارے کر رہے تھے۔ میں یہ منظر اپنی دور بین سے دیکھ رہا تھا۔ میرا خون کھول اٹھا لیکن ابھی صبر کرنا ضروری تھا۔ کلاشن کوف کی چند میگنیزین کے علاوہ میرے پاس وائرلیس سیٹ بھی تھا۔ میں دھان کے ایک کھیت کے کنارے پتھر کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ مجھے چاروں طرف کا منظر اچھی طرح دکھائی دے رہا ہے لیکن میں نے خود کو

اس طرح کیمو فلاج کیا ہوا تھا کہ بغور دیکھنے کے بعد ہی کوئی جان سکتا تھا کہ یہاں کوئی انسان لیٹا ہوا ہے۔

دریا مجھ سے صرف دو میٹر کے فاصلے پر بہہ رہا تھا اور دریا کی دوسری طرف سڑک تھی۔ چار بجے کے قریب بھارتی فوج کی چند گاڑیاں آتی دکھائی دیں، جن پر گنیں نصب تھیں۔ بھارتی فوج کے کمانڈوز بڑے چوکنے انداز میں گنیں تھامے کھڑے تھے۔ یہ اس قافلے کا ہر اول دستہ تھا اور اسی کا کام تھا کہ پیچھے آنے والے قافلے کو راستہ صاف ہونے کا سگنل دے۔ میں نے ان گاڑیوں کو گزرنے دیا تاکہ یہ پیچھے آنے والوں کو ”سب اچھا“ کا سگنل دے دیں۔ اس کے معاً بعد بھارتی فوج کی سبز رنگ کی ایک وی آئی پی بس نمودار ہوئی۔ اس وقت شام چار بجے کا وقت تھا۔ میرے ذہن میں اپنا اعلان گونج رہا تھا جو میں نے گزشتہ روز قلم بین کشمیری بھائیوں کے سامنے کیا تھا۔

اللہ کا مبارک نام میری زبان پر آیا اور پہلی بس کی درمیانی کھڑکی کو نشانہ بنا کر کلاشن کوف کا پورا برسٹ دے مارا۔ بس پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی، اس لیے بس کے پچھلے نصف حصے کے فوجی میری گولیوں کا نشانہ بنتے رہے۔ بس کے شیشے ٹوٹ گئے اور اندر سے چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ بس کی اگلی سیٹ پر مسلح فوجی بیٹھے تھے۔ میں نے ان کو اور ڈرائیور کو جان بوجھ کر نشانہ نہیں بنایا تھا، اس لیے کہ اس صورت میں بس رک جاتی اور میں دوسری گاڑیوں پر حملہ کرنے سے محروم رہ جاتا اور میری پوزیشن بھی افشا ہو جاتی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ بس کے اندر نشانہ بننے والے اعلیٰ فوجی افسر ہیں۔ عام فوجیوں کی نسبت انہیں نشانہ بنانا زیادہ مفید تھا۔ جوں ہی پہلی میگنرین خالی ہوئی میں نے فوراً دوسری میگنرین کلاشنکوف میں لگائی۔ اتنے میں دوسری بس میری رینج میں آچکی تھی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے

کلاشکوف کا ایک اور بھرپور برسٹ اس کے شیشوں پر مارا، یہ بھی تیزی سے گزر گئی۔ میں نے تیسری میگزین فٹ کی تو تیسری بس سامنے آگئی، اس کا بھی وہی حشر کیا۔ ان بسوں کے درمیان سو سو گز کا فاصلہ تھا، میں نے تینوں بسوں پر تیس تیس راؤنڈ کامیابی سے فائر کر دیئے تھے۔ میری فائرنگ کے ساتھ ہی سڑک پر دور دور تک تعینات فوجی دستوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ چند منٹ کے اندر اندر سارے علاقے میں فائرنگ پھیل گئی۔ فوجی کسی سمت کا تعین کیے بغیر فائر کر رہے تھے۔ میرے بالکل سامنے ٹیکری والے فوجی بھی فائرنگ کرنے لگے تھے، لیکن ان کو بالکل علم نہیں تھا کہ ان کا ہدف کون ہے، کہاں ہے۔ دریا کے شور کی وجہ سے ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ فائر کہاں سے ہوا ہے۔ دوسری طرف سامنے سے حسب پروگرام حافظ صاحب نے شروع میں گزرنے والی چاروں جیپوں پر پیکا سے فائر کیے، اس کے بعد میری ہدایت کے مطابق روشنی کے گولے فائر کرنے شروع کر دیئے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ فوجیوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ حملہ جنگل کی جانب سے ہوا ہے۔ فوج نے فوری طور پر جنگل کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گولیاں اور گولے حافظ صاحب کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ مجھے ان کے متعلق اطمینان تھا کہ وہ محفوظ جگہ پر ہیں۔ جن بسوں پر میں نے فائر کیے تھے ان کے ڈرائیوروں نے گاڑیوں کو برق رفتاری سے دوڑانا شروع کر دیا۔ ان کے اندر خاصی تباہی ہو چکی تھی، خون گاڑیوں سے باہر چھینٹوں کی شکل میں اڑ رہا تھا اور ایک لکیر کی صورت میں سڑک پر بھی گر رہا تھا۔ کنگن کا قصبہ وہاں سے پانچ کلومیٹر دور تھا۔ یہ گاڑیاں وہاں پہنچیں تو لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ فوجی گاڑیوں سے خون بڑی مقدار میں بہہ رہا ہے۔ خون کے چھینٹے سڑک سے گزرنے والے شہریوں پر بھی لگے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کے خون آلود کپڑے دیکھے۔

دو سو گاڑیوں کے اس کارواں کی سات گاڑیاں آگے گزر گئی تھیں، جن میں تین بسیں اور چار جیپیں شامل تھیں۔ باقی گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے فائرنگ کی آوازیں سن کر گاڑیوں کو روک لیا تھا۔ سترانہ سے لداخ کی طرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر بن باغ نامی گاؤں ہے، یہاں فوجی گاڑیوں کے ایک اڈے پر بہت سی فوجی گاڑیاں رک گئیں۔ کچھ نے اس سے پیچھے ٹھیون کے مقام پر پڑاؤ کر لیا۔ فوج کا ایک ریست ہاؤس قریب تھا، کچھ فوجی افسروں نے گاڑیوں سے اتر کر اس ریست ہاؤس میں پناہ لے لی۔ ایک گھنٹے تک میں اسی مقام پر خاموشی سے لیٹا رہا۔ حافظ منشا قمر کی طرف سے روشنی کے گولے فائر ہونے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ ہم فوجیوں کو حملے کے مقام کے بارے میں دھوکے میں رکھنے میں کامیاب رہے، ورنہ میرے سامنے ٹیکری والے فوجی جو اندھا دھند جنگل کی طرف فائر کر رہے تھے، غور سے دیکھتے تو میں کھیتوں میں انہیں نظر آ جاتا۔ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ انہوں نے قریب ہی دو بھاری گنیں بھی نصب کی ہوئی ہیں۔ یہ محض اللہ کا فضل تھا کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا اور وہ ان گنوں سے دوسری طرف فائر کرتے رہے تھے، ورنہ مجھے آسانی کے ساتھ نشانہ بنا سکتے تھے۔

سورج غروب ہو گیا تو میں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے مقام سے پچاس میٹر رینگتے ہوئے پیچھے چلا گیا۔ وہاں دوبارہ پوزیشن لے کر حالات کا جائزہ لیا۔ فائرنگ اب کافی حد تک ختم چکی تھی۔ میں نے غور سے اپنی گن کو دیکھا۔ مسلسل فائرنگ سے گرم ہو کر اس کے بیرل کا تھوڑا سا حصہ پھٹ گیا تھا، مگر ابھی قابل استعمال تھی۔ اس دوران اچانک میری نظر ایک فوجی پر پڑی جو مجھ سے تقریباً ڈیڑھ سو میٹر کے فاصلے پر دریا کی دوسری جانب سڑک پر گولیوں کے خول تلاش کر رہا تھا۔ میں نے کلاشن کوف کی میگنیزین میں ایک راؤنڈ ڈالا اور اس فوجی کا نشانہ لے کر فائر

کر دیا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گرا، پھر اٹھا اور گرتا پڑتا آگے
 بڑھنے لگا۔ اس دوران اس کا ایک ساتھی دوڑتا ہوا آیا اور زخمی سے لپٹ کر اپنے
 ساتھ زمین پر گرالیا۔ میں رکے بغیر پیچھے کی جانب رینگتا رہا۔ چند منٹ کے بعد
 جب کوئی سو گز مزید پیچھے کی طرف نکل گیا تھا، میں نے دوبارہ ان فوجیوں کو مڑ کر
 دیکھا۔ شاید زخمی ہونے والا فوجی مرچکا تھا، اس کے قریب چار دوسرے فوجی کھڑے
 تھے۔ ان کو اس طرح کھڑے دیکھ کر میرا جی لپٹا گیا۔ میں نے پھر سے کلاشن کوف کو
 نشانے پر رکھا اور ایک فوجی کو گرالیا۔ باقی تیزی سے زمین پر لیٹ گئے۔ اب دوبارہ
 فائرنگ میری جانب شروع ہو گئی۔ میں مزید چند میٹر پیچھے چلا گیا اور وہاں دوبارہ
 پوزیشن لے کر سامنے سڑک پر فوجیوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ دیر ہی
 گزری تھی کہ سڑک پر دو فوجی گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ یہ گاڑیاں یقیناً ان فوجیوں
 نے وائرلیس سیٹ پر پیغام بھیج کر زخمیوں اور ہلاک ہونے والوں کو اٹھانے کے لیے
 منگوائی تھیں۔ گاڑیاں بڑی تیزی سے آ رہی تھیں۔ اچانک میرے بالکل سامنے
 ایک فوجی سڑک پر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس ساری کارروائی کے دوران سڑک کے
 کنارے بنے ہوئے پتھروں کے پشتے کی اوٹ میں چھپا رہا تھا۔ جوں ہی اس نے
 گاڑیوں کو دیکھا تو اس خیال سے اٹھ کھڑا ہوا کہ خطرہ ٹل چکا ہے۔ میری گن بالکل
 تیار حالت میں تھی۔ میں نے تاک کر فائر کیا، گولی اس کی پیٹھ میں لگی اور وہ بھی
 سڑک پر گر گیا۔ اس کے گرتے ہی ایک تیز رفتار گاڑی اسے روندتے ہوئے گزر
 گئی۔ چند گز آگے جا کر یہ گاڑی رک گئی، اور اس کے پیچھے آنے والی گاڑی بھی
 رک گئی۔ میرے پاس اب راونڈ ختم ہو چکے تھے، ورنہ ان دونوں گاڑیوں کے فوجی
 بھی میری رینج میں تھے۔ یہ نصرت الہی کا کرشمہ تھا کہ میں اپنی زخمی گن کے ساتھ
 آخری گولی تک لڑتا رہا۔ پھر دل ہی دل میں ایمونیشن ختم ہونے پر کف افسوس ملتا

درمیان سے ہوتے ہوئے اس مکان کے دروازے پر پہنچا جہاں حافظ منشا قمر نے میرا انتظار کرنا تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میزبان نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس مسکراہٹ کے پردے میں یہ خوش خبری پوشیدہ تھی کہ حافظ صاحب بخیر و عافیت وہاں پہنچ چکے ہیں۔ حافظ صاحب نے جوں ہی مجھے دیکھا، فرط محبت سے اٹھ کر لیٹ گئے۔

رات کا کھانا کھانے اور نماز عشا ادا کرنے کے بعد میزبان سے جانے کی اجازت طلب کی۔ ہم اپنے کسی ہمدرد کو امتحان میں اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے کہ اب ہمیں یقین تھا کہ فوج پورے علاقے کے چپے چپے کو چھانے گی۔ ہم نے عافیت وہاں سے نکل جانے میں ہی جانی۔ ہم حسب معمول قریبی جنگل میں چلے گئے۔ اگلے روز نماز فجر ادا کی، ہمارے لیے ناشتا آگیا تھا۔ ناشتہ لانے والوں میں سکولوں کے بہت سے بچے شامل تھے۔ اب گاؤں کا بچہ بچہ مجھ سے واقف ہو چکا تھا۔ ہم ناشتہ کر رہے تھے اور بچے ہماری گنوں کو اٹھا کر مختلف پوزیشنیں لے کر اپنے مجاہدانہ شوق کی پیاس بجھا رہے تھے۔ میں یہ منظر دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کشمیر کا بچہ بچہ بھارت سے صف آرا ہے۔

گزشتہ شام کے برعکس اب لوگوں کے چہروں سے خوف و ہراس چھٹ چکا تھا اور اطمینان سے ہمارے پاس آتے جاتے تھے۔ ہمارے پاس آنے والے نوجوان گزشتہ روز کے حملے سے ہونے والے فوجی نقصانات کی رپورٹ بھی لائے تھے۔ اس خطرے کے پیش نظر کہ لاشوں کو اٹھاتے ہوئے مجاہدین پھر حملہ نہ کر دیں، فوجیوں نے سول گاڑیاں منگوا کر لاشوں اور زخمیوں کو اٹھایا تھا۔ اگلے دن اس سارے علاقے میں سڑک کے دونوں اطراف میں ہزاروں فوجیوں کو حفاظت کے لیے تعینات کر دیا گیا۔ یہ فوج کنگن اور بادامی باغ سری نگر سے آئی تھی۔ اس فوج

نے سڑک کے دونوں اطراف میں چپے چپے پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ انتظامات مکمل ہو گئے تو دن کے گیارہ بجے دو سو گاڑیوں کے اس قافلے کو وہاں سے گزارا گیا، جو گزشتہ روز ہماری فائرنگ کی وجہ سے واپس چلا گیا تھا۔

جن تین بسوں کو میں نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، انہوں نے ر کے بغیر یادامی باغ سری نگر پہنچ کر دم لیا۔ تیس تیس راؤنڈ کھا کر یہ بسیں ایک طرف سے چھلنی ہو گئی تھیں۔ گولیوں سے چھلنی، خون آلودہ اور خستہ حال بسوں کو سری نگر شہر سے گزرتے ہوئے ہر خاص و عام نے دیکھا۔ انہیں معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہ آئی۔ اس طرح ہماری اس کارروائی کی اطلاع ان بسوں کے ذریعے سری نگر کے گلی کوچوں تک پہنچ گئی۔ دوسری طرف لداخ سری نگر روڈ پر متعین حفاظتی عملہ اس بات پر خوش تھا کہ اتنی بڑی کارروائی کے باوجود ان کے محض تین فوجی مارے گئے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اصل جانی نقصان تو بسوں میں سوار فوجیوں کا ہوا ہے۔ ان میں اکثر فوجی افسر تھے۔ چند ایک کے ساتھ اہل خانہ بھی تھے۔ بارہ فوجی افسروں کی ہلاکت کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے علاوہ درجنوں زخمی بھی تھے۔ یہ فوجی افسر چھٹی پر ہندوستان کے مختلف شہروں کو جا رہے تھے۔

ہمارے حملے کے دوسرے دن فوج کے حکم پر کنگن کے چند ٹرک ڈرائیور راشن لے کر لداخ گئے۔ اگلے روز ٹرک واپس آئے تو ڈرائیوروں نے بتایا کہ لداخ میں فوجیوں نے احتجاجاً کام کرنا بند کر دیا ہے۔ وہ اپنے افسروں کی ہلاکت پر سخت مشتعل تھے اور اس کی ساری ذمہ داری وہ لداخ سری نگر ہائی وے کے حفاظتی فوجی اور نیم فوجی عملے پر عائد کر رہے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ غفلت اور بزدلی کی وجہ سے فوج کو اپنے قیمتی افسروں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ احتجاج کا اصل

سبب یہ تھا کہ جلد یا بدیر انہوں نے اسی شاہراہ سے گزر کر جانا تھا، افسروں کی ہلاکت پر افسوس سے زیادہ انہیں اپنی موت کا خوف تھا۔

فوجی حکام نے اس حملے کے بعد سری نگر لداخ ہائی وے پر غیر معمولی حفاظتی اقدامات کرنے شروع کر دیئے۔ بارہ ہزار تازہ دم فوج منگوائی گئی۔ کنگن کے قریب ایک مرکزی کیمپ قائم کیا گیا۔ اس کے علاوہ چھ مزید کیمپ قائم کیے گئے۔ کنگن کے بڑے کیمپ سے بھی فوج کو نکال کر اس شاہراہ کے ارد گرد پھیلا دیا گیا اور درجنوں نئے بنگر قائم کیے گئے۔ کنگن کے ایک پرانے سکول کو بھی فوجی کیمپ میں بدل دیا گیا۔ اس شاہراہ کے تقریباً "ستر کلومیٹر پر سارا دن فوجی حفاظتی ڈیوٹی سرانجام دینے لگے۔ وہ صبح کیمپوں سے نکلتے اور سارا دن پہرہ دینے کے بعد سرشام گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے کیمپوں کو لوٹ جاتے۔ یہ سب ایک کامیاب کارروائی کا نتیجہ تھا۔ ہم نے محض سو، دو سو گولیاں خرچ کر کے اور پندرہ سولہ فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر فوج کو کروڑوں روپے کے اضافی اخراجات کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس پر مستزاد ان دیکھی موت کا خوف تھا۔ ہر فوجی رات دن خوف کا شکار رہنے لگا کہ نجانے کب کوئی گولی آکر اس کی کھوپڑی میں سوراخ کر دے۔

اس کے باوجود وہ اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔۔۔۔۔؟ کیا انہوں نے لداخ کا اپنا راستہ مکمل طور پر محفوظ کر لیا۔۔۔۔۔؟ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

اس کارروائی کے چند دن بعد سری نگر سے عبدالرحمان بھائی، اسد اللہ بھائی اور صابر بھائی ہمارے پاس آ پہنچے۔ وہ حمزہ سنگریا اور حبیب اللہ بخاری کو لے کر سری نگر گئے تھے اور دونوں زخمیوں کا ایک ہسپتال میں علاج کرایا تھا۔ بعد میں دونوں زخمیوں کو حزب المجاہدین کے مقامی نظم کے حوالے کر دیا تھا جنہوں نے ان کا

علاج مکمل ہونے تک ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرنی تھی۔ اس ذمہ داری کو نبھانے کے بعد کچھ عرصے تک یہ پاکستانی مجاہد سری نگر اور اس کے مضافات میں ہی رک گئے تھے۔ مجھے انہوں نے اپنی سرگرمیوں سے آگاہ رکھا ہوا تھا اور اب وہ دوبارہ میرے پاس پہنچ چکے تھے۔ ان کے ہمراہ چند کشمیری مجاہدین بھی تھے۔ ان کو ساتھ لے کر میں چند دن کے لیے ٹنگ چھتر کے جنگل میں چلا گیا۔ موسم میں خوشگوار تبدیلی آچکی تھی۔ سورج کی تیز چبھتی کرنوں سے ہم دور رہنے میں ہی عافیت سمجھتے تھے۔ چند دن تک ہم نے مجاہد ساتھیوں کی خاطر تواضع کی اور آرام کرنے کا موقع دیا، لیکن پھر میدان جہاد کو گرم کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ ایک دن میں نے عبدالرحمان بھائی سے کہا۔۔۔۔۔ ”فوج گزشتہ حملے کے زخم بھول چکی ہوگی، کیوں نہ ایک مرتبہ پھر اس کی خبر لی جائے۔“ عبدالرحمان بھائی نے مسکراتے ہوئے اسد اللہ بھائی کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ انہوں نے ازراہ مذاق کہا۔۔۔۔۔!

”ہم آپ کے مہمان ہیں اور آپ مہمانوں کو آرام نہیں کرنے دیتے۔۔۔۔۔؟“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”مہمانی کے تین دن تو پورے ہو چکے۔۔۔۔۔ حدیث کے مطابق مہمانی کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ اور اب مہمانوں ہی کی خاطر تواضع کے لیے ”شکار“ ضروری ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا: ”آپ نے ہمارے آرام میں مخل ہونا ہی ہے تو ہماری طرف سے بھی ”ہاں“ سمجھیے۔“

اگلے روز نماز فجر یا جماعت ادا کر کے نیچے گاؤں میں گئے۔ ناشتے کے دوران ہی ہمارے چند معاون پہنچ گئے۔ یہ بات بتاتا چلوں کہ ہمارے مخبر اپر گراؤنڈ مجاہدین ہوتے ہیں اور جو فی سبیل اللہ ہمیں اطلاعات مہیا کرتے ہیں۔ ان سے گپ شپ ہوتی رہی۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے ہمیں علاقے میں فوج کی آمد و رفت اور

نقل و حرکت سے آگاہ کیا۔ اس روز اتوار تھا اس لیے فوج کی نقل و حرکت چھٹی کی وجہ سے بند تھی۔ انہوں نے خبر دی کہ آج بارڈر سیکورٹی فورس (BSF) کا ایک اعلیٰ افسر یہاں سے گزر کر غنی ون جائے گا۔ یہ افسر اس علاقے میں بی ایس ایف کے کیمپوں کے دورے پر تھا۔ یہ خبر سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا، یہ تو اچھا ہوا کہ ہمیں بروقت اطلاع مل گئی۔ ورنہ اس کے ”استقبال“ سے محروم رہ جاتے۔ مقامی معاونین سے ہم نے اس دورے کی مکمل تفصیل معلوم کیں۔ اس کے بعد گھات لگانے کے لیے ایک قریبی مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم آٹھ مجاہد تھے۔ جن میں چار پاکستانی اور چار کشمیری تھے۔ ہمارے پاس دو پیکاپ گئیں تھیں۔ ہم نے گاؤں سے چند سو میٹر دور ایک ایسے مقام کو گھات کے لیے منتخب کیا جہاں دریا بالکل سڑک کی ناک کے نیچے بہہ رہا تھا۔ دن کے نو بج رہے تھے اور یہی وقت تھا جب ہماری اطلاع کے مطابق بی ایس ایف کے اعلیٰ افسر نے یہاں سے گزرنا تھا۔ پروگرام کے مطابق عبدالرحمان بھائی نے فائرنگ کا آغاز کرنا تھا اور باقی کام ہمارے سپرد تھا۔ چند منٹ کے بعد گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ عبدالرحمان بھائی ریڈیو پر ترانے سننے میں اس قدر محو تھے کہ گاڑیاں گزر گئیں اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ ہم ان کی طرف سے حملے کے منتظر تھے۔ گاڑیوں کے گزرنے کے بعد میں نے سیٹی بجا کر انہیں متوجہ کیا اور اشارے سے کہا، گاڑیاں تو گزر گئی ہیں..... وہ افسوس کا اظہار کرنے لگے، لیکن اب لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہ تھا، سانپ نکل چکا تھا۔

چند منٹ تک ہم وہیں لیٹے افسردگی سے سوچتے رہے کہ اب کیا کیا جائے۔ اچانک میری نظر سڑک پر پڑی، کوئی چار سو میٹر کے فاصلے پر بیس پچیس فوجی آرہے

تھے۔ یہ بی ایس ایف کے وہ جوان تھے جو اپنے افسر کی حفاظت کی خاطر یہاں پہرہ دینے آئے تھے اور اس کے گزرنے کے بعد وہ بھی واپس کیمپ میں جا رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہا..... سانپ تو نکل گیا، لہذا اب سپنولیوں کو نشانہ بناتے ہیں۔ میرے ساتھی اچانک اور پلاننگ کے بغیر حملے کے حق میں نہ تھے، لیکن میں نے ان کی ایک نہ مانی۔ گن اٹھائی اور تیزی سے سڑک پر چلا گیا۔ میں نے کمانڈو وردی پہن رکھی تھی۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے سے سڑک پر بالکل سامنے سے جب میں نے ان فوجیوں پر گن تانی تو وہ مبہوت ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ ایک بھارتی فوجی کیوں ان کو نشانہ بنا رہا ہے۔ قبل اس کے وہ کوئی حرکت کرتے میری گن نے فائر اگلے اور سامنے کھڑے چار فوجی سڑک پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ باقی فوجیوں نے صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے چھلانگیں لگائیں اور سڑک کے اطراف میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ میں نے بھی کوئی وقت ضائع کیے بغیر سڑک کے کنارے کی جانب چھلانگ لگا دی اور دیوار کی اوٹ سے ہوتے ہوئے ایک چھوٹی سی نہر کے پاس پہنچ گیا۔ مجھ پر فوجیوں نے گولیوں کی بارش شروع کر دی تھی، انہوں نے زیادہ تر فائر میری طرف کیے تھے۔ لیکن میں ان کی نظروں سے اوچھل ایک محفوظ مقام پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے سڑک سے کچھ دور بننے والی ایک نہر کے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ تقریباً دو سو میٹر آگے جا کر یہ نہر قریبی جنگل سے جا ملتی تھی، وہیں پر میرے ساتھی میرے منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی جان میں جان آئی۔ فائرنگ شدت اختیار کر رہی تھی اس لیے میں اپنے ساتھیوں کو لے کر جنگل میں روپوش ہو گیا۔ دو گھنٹے تک فائرنگ تسلسل سے ہوتی رہی لیکن ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم اپنا قیمتی ایمونیشن ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دشمن کے پاس اسلحے اور

ایمونیشن کی کوئی کمی نہیں تھی۔ فوجی اندھا دھند گولیاں اس لیے بھی چلاتے ہیں کہ بعد میں اپنے افسروں کے سامنے بڑے فخر سے کہہ سکیں کہ ہم نے اتنی سو گولیاں اگر وادیوں پر چلائی ہیں۔ افسر موقع پر ہوتے نہیں یا جھڑپ کی صورت میں ساری صورت حال ان کے قابو میں نہیں رہتی اس لیے وہ کسی فوجی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے گولیاں غلط ٹارگٹ پر فائر کی ہیں۔

دو گھنٹے بعد جب فائرنگ کا سلسلہ ٹھنڈا پڑا تو ایک بکتر بند گاڑی وہاں آئی، اس نے گولیوں کا نشانہ بننے والے فوجیوں کو اٹھایا۔ ان میں سے تین مرچکے تھے جبکہ ایک زخمی تھا۔ اس وقت دن کے بارہ بج چکے تھے۔ میں یہ ساری کارروائی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دور بین کے ذریعے جنگل کے ایک بلند مقام سے دیکھتا رہا۔ ایک بجے کے لگ بھگ فوج اس علاقے کو خالی کر کے چلی گئی۔ کھانا ہم نے جنگل میں ہی منگوا کر کھایا اور وہیں ایک درخت کے نیچے چشمے کے کنارے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔

اگلے دن میں نیچے گاؤں میں گیا، وہاں لوگوں نے چند مکانات دکھائے جن کی کھڑکیوں اور دروازوں کو فوج نے گولیوں نے چھلنی کر دیا تھا۔ میں نے متاثرین سے اظہار ہمدردی کیا اور بتایا کہ آزادی اور جہاد کی تحریکوں میں ہمیں اس طرح کی قربانیوں کے لیے ہمہ تن تیار رہنا ہو گا۔

اس کارروائی کے بعد ہم نے ایک اور کامیاب چال چلی۔ اپنے مجبوروں کے ذریعے ہم نے یہ افواہ پھیلا دی کہ بی ایس ایف پر دراصل فوج نے حملہ کیا تھا۔ بی ایس ایف کو پہلے ہی شک تھا کہ ان پر فوج نے حملہ کیا ہے، کیونکہ میں نے فوج کی وردی پہن رکھی تھی۔ یہ افواہ پھیلنے کی دیر تھی کہ ان کا شک یقین میں بدل گیا۔ بی ایس ایف اور فوج کے درمیان عموماً تناؤ کی کیفیت رہتی ہے، دونوں فورسز ایک

دوسرے کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ کچھ دن بعد ہمیں یہ اطلاع ملی کہ اس واقعے کے بعد ایک نزدیکی کیمپ میں فوج اور بی ایس ایف کے درمیان زبانی جھگڑے نے ایک دوسرے کے خلاف مسلح صف بندی کی شکل اختیار کر لی۔ دونوں جانب سے فائرنگ ہوئی۔ اس فائرنگ کی گھن گرج مقامی آبادی نے سنی لیکن دونوں فورسز کے نقصانات کو صیغہ راز میں رکھا گیا۔

ذہنی تناؤ اور جسمانی مشقت کی وجہ سے ہم سب خاصے تھکے ہوئے تھے۔ لہذا چند روز کسی گوشہ عافیت میں گزارنے کا فیصلہ ہوا اور ہم نے ٹنگ چھتر کی راہ لی۔ یہاں کے بلند و بالا پہاڑ اور خوشگوار موسم ہمیں محبت اور شفقت سے آغوش میں لینے کو موجود تھے۔ پہاڑ پر ہم نے ایک نئی کمین گاہ بنائی۔ کنگن سے راشن منگوا یا، برتن اور کراکری کا دوسرا ضروری سامان بھی منگوا لیا۔ ہم چھ پاکستانی مجاہد تھے جو مستقل طور پر یہاں قیام پذیر ہوئے۔ کشمیری مجاہدین کا آنا جانا بھی رہتا تھا۔ ہم نے وسیع پیمانے پر رہائش اور خورد و نوش کا بندوبست کر لیا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ پہاڑوں پر برف پکھلنے کی وجہ سے راستے کھلیں گے اور پاکستان سے نئے مجاہد بھی آئیں گے۔ مقامی مجاہدین کو تربیت کے لیے بھیجنے کی خاطر لانچنگ کا ہم نے باقاعدہ ایک شعبہ قائم کیا جس کی ذمہ داری عبدالرحمان بھائی کو سونپی گئی۔ وہ شوق جہاد سے لبریز بہت سے مقامی نوجوانوں کو بیس کیمپ بھیجنے کا اہتمام کرنے لگے۔

ان ایام میں ہمارا بیشتر وقت عبادت میں گزرتا تھا۔ ترانے بھی سنتے سنا تے، کچھ دیر گپ شپ بھی ہوتی، مستقبل کی منصوبہ بندی بھی کرتے، دشمن کو زک پہنچانے کے طریقے ڈسکس کرتے، جہاد میں زندگی گزارنے کا عزم اور تمنائے شہادت کا ذکر بھی ہوتا۔ تحریک آزادی کشمیر کے شعلہ نوا شاعر سلیم ناز بریلوی کی تمام کیسٹیں ہمارے پاس تھیں، ہم انہیں سنتے تھے۔ کنگن شہر کی آڈیو ویڈیو شاپس سے ہر قسم کے

جہادی ترانوں کی کیسٹ مل جاتی تھی۔ تحریک آزادی کشمیر کے تازہ حالات سے باخبر رہنے کے لیے ریڈیو صدائے حریت کشمیر سنتے تھے۔ کھانا وغیرہ مل کر پکاتے تھے۔ ہم زیادہ ماہر یا ورچی تو نہیں تھے لیکن مل جل کر کھانا پکانے میں بے حد مزا آتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ہم پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ کچا پکا کھانا سب بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔

عبدالرحمان بھائی کے لانچنگ کے کام میں دوسرے پاکستانی ساتھی بھی شریک تھے۔ ان کو زیادہ تر مختلف دیہات میں رہنا پڑتا تھا۔ جموں کے درجنوں بکروال ان ایام میں کنگن کے جنگلوں اور پہاڑوں سے گزرتے ہیں۔ وہ لائن آف کنٹرول کے آس پاس کے علاقے کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ ان محفوظ راستوں سے بھی آگاہ تھے جن سے گزرنے میں مجاہدین بھارتی فوج کی نظروں میں نہیں آتے۔ میں نے ان چرواہوں سے مجاہدین کو آزاد علاقے تک پہنچانے کے لیے مذاکرات کیے۔ انہیں آمادہ کرنے کے لیے کہیں دلائل سے کام نکلا، کبھی لالچ اور کبھی دھمکیاں بھی دینی پڑیں۔

سرحدی علاقوں میں بھیڑ بکریاں چرانے والے ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں کچھ علم نہیں کہ وادی میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کسی بلند و بالا مقصد کا نہیں بلکہ صبح و شام ہونے کا نام ہے۔ ان سے کام لینے کے لیے بعض اوقات دوسرے حربے بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں اکثریت قربانیاں دینے والوں کی بھی ہے جو مجاہدین کی راہنمائی کرتے ہوئے خود بھی بعض اوقات گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں یا پھر کسی بارودی سرنگ کی زد میں آکر زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتے ہیں۔ یہ اکثر اپنے کام کا معاوضہ بھی نہیں لیتے۔ اگر ان ایثار پیشہ لوگوں کا بے لوث تعاون مجاہدین اور تحریک کو میسر نہ ہو تو جہاد جاری رکھنا ممکن نہ ہو۔ اللہ ان کو اجر

عظیم عطا کرے۔

قصہ کوتاہ ان چرواہوں میں سے چند ایک کو تعاون پر آمادہ کر کے عبدالرحمان بھائی کے حوالے کیا۔ عبدالرحمان بھائی اس دوران بہت سے نوجوانوں کو بیس کیمپ روانگی کے لیے تیار کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کو دس دس اور بیس بیس کے گروپوں میں آزاد خطے کی طرف روانہ کیا۔ اس سیزن میں ایک سو سے زیادہ نوجوانوں کو ہم نے میدان جہاد میں اتارا۔ ڈسٹرکٹ کمانڈر شاہد الاسلام سے ست پال کے خاتمے کے بعد پھر ملاقات نہ ہو سکی تھی، وہ زیادہ تر گاندربل اور اس کے مضافات میں مقیم رہتے تھے۔

بارودی سرنگیں

پندرہ دن اس مقام پر پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ پاکستانی ساتھی عبدالرحمان بھائی کے ہمراہ تھے۔ صرف حمزہ سنگریا میرے ساتھ رہ گئے تھے۔ ان کے زخم اب مندل ہو گئے تھے اور دوبارہ ہاتھ کھولنے کے لیے بے تاب تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ میرا بھی خیال تھا کہ بھارتی فوج کی غلور ضروری ہے۔ بے چین پنچھی پر کھولنے کے لیے بے تاب تھے۔ مجاہد کو متحرک رہنا چاہیے، اسے چین سے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایک دن ہم نے نماز فجر اپنی کمین گاہ میں ادا کی اور ناشتے کے بعد اگلے گاؤں روانہ ہو گئے۔ دس بجے کے قریب ہم اس گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے۔ گاؤں کے افراد نے ہمیں دیکھا تو سمجھ لیا کہ اب فوج پر بجلی گرنے والی ہے۔ دن بھر ہم گاؤں میں رہے، اس دوران بہت سے لوگ ہم سے ملنے آئے۔ ہم نے ان سے فوج کی نقل و حرکت اور تازہ کارروائیوں کی مفصل رپورٹ لی۔ ان گمنام مجاہدوں کا ہماری کارروائیوں کی کامیابی میں مرکزی

کردار ہے۔ کسی بھی حملے کی پیش بندی میں ان ہی کی اطلاعات کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے معلوم ہوا کہ ہم نے سندھ ندی کے بالکل ساتھ سڑک کی دیوار کے پیچھے جو کارروائی کی تھی وہاں فوج نے اب باقاعدہ حفاظتی دستہ تعینات کر دیا ہے، جو دن بھر وہاں رہنے کے بعد رات کو واپس قریبی کیمپ میں چلا جاتا ہے۔ یہ فوجی سڑک کے کنارے بنی تین فٹ اونچی اور دس گز لمبی دیوار کی آڑ میں گتیں تان کر سڑک کی حفاظت کرتے تھے۔ مجھے فوج کی اس تازہ حکمت عملی کا علم ہوا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی، میں نے اس کا ذکر حمزہ سنگریا سے کیا۔ اس نے کہا، کام مشکل ضرور ہے لیکن اس کے فوائد سے انکار ممکن نہیں اور اس میں بڑا مزا آئے گا۔ ہم نے اس کارروائی کے لیے مکمل منصوبہ بندی کر لی۔

رات کا کھانا ہم نے گاؤں میں کھایا۔ نماز عشا ادا کرنے کے بعد میں نے حمزہ سنگریا اور تین مقامی مجاہدوں کو ساتھ لیا اور ندی عبور کر کے سڑک پر جا پہنچا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ہم نے گزشتہ کارروائی میں بی ایس ایف کے فوجیوں کو لہو لہان کیا تھا۔ گھینٹیاں اور نیلچے ہمارے پاس تھے۔ میں نے ساتھیوں کو دو دو میٹر کے فاصلے پر پانچ گڑھے کھودنے کے لیے کہا۔ نصف گھنٹے بعد یہ گڑھے مطلوبہ شکل میں تیار ہو چکے تھے۔ اس کے بعد جلدی سے ان میں دو دو کلو بارود فٹ کیا اور تاروں کے ذریعے اسے ایک مرکزی تار سے جوڑ دیا۔ اس کے بعد ہم نے چند انچ گہری اور دو سو میٹر لمبی ایک نالی کھود کر اس تار کو اس میں دفن کرتے ہوئے قریبی کھیت میں پہنچا دیا۔ کھیت کے کنارے گھنی جھاڑیاں تھیں اور کھیت میں چھوٹی چھوٹی فصل بھی تھی۔ گڑھوں اور نالی پر مٹی ڈال دی تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ یہ جگہ تازہ کھودی گئی ہے۔ چودھویں کے چاند میں یہ سارا کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ایک کشمیری ساتھی کو ہم نے بستر وغیرہ دے کر اس مقام سے آدھ کلو میٹر دور ایک محفوظ مقام پر رات

بسر کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اس مجاہد کی ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ صبح سویرے وہاں پہنچ جائے جہاں بارود کو بیٹھری کے ساتھ لگانا تھا۔ فوجی صبح نو بجے تک دیوار کے پاس آکر پوزیشن لے لیتے تھے۔ پوزیشن لیتے ہوئے انہیں بارود کے عین اوپر لیٹنا یا بیٹھنا تھا۔ عین اس وقت مجاہد نے تاروں کو بیٹھری کے ساتھ جوڑ دینا تھا۔ رات بارہ بجے کے قریب اپنے ساتھی کو پوری طرح اس کا کام سمجھا کر میں دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ نالہ سندھ کو لکڑی کے ایک پل کے ذریعے عبور کر کے اپنے علاقے میں پہنچ گیا۔

رات کے بچے ہوئے چند گھنٹے ہم نے سو کر گزارے۔ نماز فجر کے بعد میں ساتھیوں کے ہمراہ جنگل میں پانچ سو میٹر کی بلندی پر چڑھ کر ایک ایسے مقام پر بیٹھ گیا جہاں سے ہمیں سامنے سڑک کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے دور بین سے دیکھا، ہمارا ساتھی اپنا کام کرنے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ جس جگہ اسے تار کو بیچ دینے کے لیے لیٹنا تھا وہاں سے اسے فوجی نظر نہیں آتے تھے۔ یہ جگہ اس لیے منتخب کی گئی تھی تاکہ فوجی بھی اسے نہ دیکھ سکیں۔ فوجیوں کے اپنی جگہ پر پہنچنے کی اطلاع اپنے ساتھی کو ہم نے دینی تھی۔ اس کے لیے طے یہ ہوا تھا کہ جب ہم تین فائر کریں گے تو وہ تار کو بیچ دے گا۔ نو بجے کے قریب میں کے لگ بھگ فوجی ایک قطار کی شکل میں نمودار ہوئے، یہ وہی فوجی تھے جنہیں سڑک کے کنارے بنائی گئی دیوار کے پاس پہرہ دینا تھا۔ میری انگلی گن کے ٹرائیگر پر چپکی ہوئی تھی۔ جیسے ہی پہلا فوجی دیوار کے قریب پہنچا میں نے پہلا فائر کر دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے دوسرا اور پھر تیسرا فائر کر دیا۔ ان فوجیوں نے فائر کی آواز سنی تو فوراً اس دیوار کی آڑ میں لیٹ گئے۔ ہم یہی چاہتے تھے۔ ابھی ان میں سے چند ہی کی گنوں سے جوابی فائر نکلے ہوں گے کہ ہمارے ساتھی نے تار بیٹھری سے جوڑ دیا۔ پھر کیا تھا۔۔۔۔۔ پانچ

خوفناک دھماکے ہوئے اور دیوار سمیت متعدد بھارتی فوجی نالہ سندھ میں جا گرے۔
 ان کے پر نیچے اڑ گئے۔ چند ایک سڑک پر لہولہان تڑپ رہے تھے۔ ان پر فائر کرنا غیر
 ضروری تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ان دھماکوں سے کوئی نہیں بچا ہو گا اور اگر کوئی بچا
 ہے بھی تو باقی عمر بستر پر ہی گزارے گا۔

جس مجاہد نے بچ دیا تھا وہ پہلے سے طے شدہ محفوظ مقام پر خیریت سے پہنچ گیا۔
 ہم نے بھی جنگل میں اپنے ٹھکانے کی راہ لی۔ اس زبردست کارروائی حملے سے فوجی
 حکام سخت مشتعل ہو گئے۔ اگلے دن ہزاروں فوجی اس جگہ منگوائے گئے۔۔۔۔۔
 اس فوج نے جنگل کے دامن میں ان تمام راستوں پر گھات لگالی جہاں جہاں سے
 ہمارے نیچے اترنے کا امکان تھا۔ مجھے وائرلیس سیٹ کے ذریعے فوج کی اس حکمت
 عملی کا علم ہو گیا تھا۔ میں اور میرے ساتھی بڑے سکون اور اطمینان سے پہاڑ کی
 چوٹی پر اپنے ٹھکانے پر آرام کر رہے تھے۔ جبکہ فوجی ہمارے انتظار میں گن گن
 کر لمحے گزار رہے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کا سارا منظر صاف نظر آتا ہے۔
 دور بین کے ذریعے فوج کی مکمل نقل و حرکت میری نظر میں تھی۔ پتا نہیں کس بے
 وقوف نے فوج کو یہ یقین دلایا تھا کہ ہم کسی بھی وقت نیچے اتریں گے۔ فوج کئی روز
 تک ان راستوں پر غیر معمولی انتظامات کے ساتھ بیٹھی رہی۔ آدھے لوگ دن کو
 اور آدھے رات کو گھات لگائے رہتے تھے۔ ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھی
 قریب ہی رکھا گیا تھا، تاکہ ضرورت پڑنے پر سارے فوجی ہمارے خلاف کارروائی
 میں شریک ہو سکیں۔ دوسری طرف ہم اپنی دنیا میں مگن تھے اور بھارتی فوج کی اس
 احمقانہ کارروائی پر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمارے پاس ضروریات زندگی کی
 فراوانی تھی۔ بھارتی فوج کا پہاڑ پر چڑھنا خود کو موت کے منہ میں ڈالنے کے
 مترادف تھا۔ ہمیں یقین تھا بھارتی فوج یہ غلطی نہیں کرے گی۔ ساتویں دن کہیں جا

کر فوج کو احساس ہوا وہ یہاں محض اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ چنانچہ احساس شکست کا نیاز خم لے کر فوج پڑاؤ اٹھا کر چلی گئی۔

فوج کے پڑاؤ اٹھانے کے اگلے دن ہم نیچے گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں کے مکینوں نے ہمیں دیکھا تو ان کے چہروں پر رونق آگئی۔ وہ ہمارے کام کی تفصیلات سے آگاہ تھے۔ ایک دن اور رات اسی گاؤں میں گزارنے کے بعد ہم اگلی صبح قریبی بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں لوگوں کی خیریت دریافت کی اور ان کی مشکلات اور مسائل سے آگاہی حاصل کی۔ کشمیر میں قیام کے دوران میری حتی الامکان کوشش رہی ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے مقامی لوگوں کے مسائل اور مشکلات کا مداوا کیا جائے۔ مقامی سطح پر چھوٹے موٹے باہمی جھگڑوں کو دور کرنے کے لیے ہم ایسے اقدامات کرتے ہیں جن سے مظلوم افراد کی کسی حد تک دادرسی ہو جائے۔ تحریک آزادی کے آغاز کے ساتھ ہی کشمیر میں سول حکام کا کام تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ ان سے بہت سے اختیارات مجاہدین نے لے لیے ہیں اور جو اختیارات بچ گئے تھے ان پر بھارتی فوج قابض ہو گئی ہے۔ مجاہدین نے عدل و انصاف کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے جس سے عام لوگوں میں مجاہدین سے محبت اور عقیدت دوچند ہوئی ہے۔ سول حکام کو ہمارے اشارے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہمارے احکام بلا چون و چرا بجا لاتے ہیں۔

مہمان مجاہدین کے لیے اہل کشمیر کے دلوں اور گھروں کے دروازوں کو میں نے ہمیشہ کھلا پایا۔ مشکل سے مشکل صورت حال میں بھی وہ ہماری مدد کر کے خوش محسوس کرتے ہیں۔ بھارتی فورسز کے بدترین مظالم اور تشدد بھی انہیں ہماری مدد سے باز نہیں رکھ سکا۔ مقامی لوگ خطرات کے باوجود بڑے اصرار اور چاؤ سے ہمیں اپنے گھروں میں کھانا کھانے پر مجبور کرتے، وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ

اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور یہ سرفروش محض ان کی مدد کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے آرام اور راحت کا مکمل خیال رکھنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مختلف دیہات میں لوگوں سے ملنے جلنے میں چند روز گزارنے کے بعد ایک بار پھر دشمن کی خبر لینے کے لیے روانہ ہوئے۔

گزشتہ کارروائیوں کے بعد فوج نے لداخ سری نگر روڈ پر حفاظتی اقدامات کو مزید بہتر بنانے کے لیے کچھ ایسے حفاظتی اقدامات کیے تھے، جن سے بارودی سرنگوں کا بچھانا کافی مشکل ضرور ہو گیا تھا، تاہم ناممکن نہیں تھا۔ بھارتی فوجی دن رات اس سڑک پر پھرے کا بندوبست کرنے سے قاصر تھے۔ ان کا پہرہ صبح سے شام تک ہوتا تھا، اس کے بعد طلوع صبح تک سڑک ہمارے لیے ”دیدہ و دل فرش راہ“ کیے رہتی تھی۔

کنگن کی جغرافیائی حیثیت ایسی ہے کہ بلند و بالا شاداب جنگلوں سے اٹے پہاڑوں کے عین درمیان میں نالہ سندھ بہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سری نگر لداخ ہائی وے گزرتی ہے۔ سندھ کے تیز و تند پانی کو عبور کرنے کے لیے لکڑی کے پل موجود ہیں۔ ندی کے ایک طرف لداخ ہائی وے کے سامنے جنگل کے دامن میں ایک کچی سڑک بھی ہے مگر اس پر گاڑیاں وغیرہ نہیں چلتیں۔ عام طور پر اسے لوگ پیدل چلنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان کنگن کی تنگ وادی زیادہ سے زیادہ دو کلو میٹر چوڑائی میں پھیلی ہوئی ہے، کہیں پر تو یہ چوڑائی صرف چند سو میٹر رہ جاتی ہے۔ شاہراہ سے جنگل کافی اونچائی پر ہے جبکہ کچی سڑک والی جانب جنگل بالکل بستیوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہی وہ علاقہ تھا جسے ہم ”اپنا“ کہتے تھے۔

آرام کے مختصر وقفے کے دوران بھی ہم فوج کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لیتے

رہے۔ ہماری تحقیق و تفتیش زیادہ تر اس موضوع پر تھی کہ ہماری تلاش اور کارروائیوں کی روک تھام کے لیے فوجی کیا کرتے ہیں۔ خلاف توقع انہوں نے زیادہ پھرتی نہ دکھائی۔۔۔۔۔ بلکہ صرف اپنی تعداد بڑھانے اور گشت میں اضافہ کرنے پر ہی اکتفا کیا۔

یہ جون ۱۹۹۴ء کا تیسرا ہفتہ تھا۔ سورج میں حدت ضرور تھی لیکن کشمیر میں اس موسم میں بھی دھوپ ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ پہاڑوں پر برف پگھلنے کی وجہ سے سندھ ندی میں پانی کی مقدار بہت بڑھ گئی تھی۔ پتھروں سے پانی کی شوریدہ سر موجیں اپنا سر ٹکراتی، شور مچاتی گزرتیں تو یہ منظر بہت بھلا لگتا۔ مجھے جب کبھی موقع ملتا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ندی کے کنارے بیٹھ کر بل کھاتے دھارے کی قوت سے لطف اندوز ہوتا۔ اس کی موسیقی سنتا اور برفانی پانی سے چھو کر آنے والی ٹھنڈی فرحت بخش ہواؤں سے لطف اندوز ہوتا۔۔۔۔۔ لیکن یہ منظر کسی شاعریا مصور کے لیے جتنی کشش کا حامل ہو سکتا تھا، میرے لیے اس میں اتنی دلچسپی کا ساماں نہ تھا۔ چند دن بعد ہی ہم اس سکون سے اکتا گئے، یہ خوب صورت منظر اپنی دلکشی کھو بیٹھا۔ ہم سکون کے اس تالاب میں کوئی بھاری پتھر پھینکنے کا موقع تلاش کرنے لگے اور وہ پھر موقع ڈھونڈ لیا گیا۔

ایک رات دس بجے کے قریب میں نالہ سندھ کو چھ ساتھیوں کے ہمراہ عبور کر کے اس مقام پر پہنچا جہاں ہم نے بارودی سرنگ سے دھماکہ کیا تھا۔ اس وقت ہمارے سامان میں گنوں کے علاوہ گھی کے دو بڑے ڈبے، شٹل گرینیڈ، بارود، تار، گینتیاں اور نیلچے شامل تھے۔ رات دس بجے کے قریب اس مقام سے فوج کا آخری گشتی دستہ بھی گزر چکا تھا۔ میں نے کارروائی کی تفصیلات سے اپنے مجاہد ساتھیوں کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اس بار ہمارا طریقہ واردات مختلف تھا۔ ہم نے

وہاں پہنچتے ہی کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ اس مرتبہ کھدائی کا کام انتہائی سہل رہا۔ گزشتہ دھماکے کی وجہ سے ایک بڑا گڑھا پہلے ہی موجود تھا جس میں مٹی ڈال کر زمین ہموار کر دی گئی تھی۔ ہم نے اسی گڑھے سے کھدائی کے بعد مٹی نکالی، گھی کے ایک ڈبے میں بارود بھرا اور اس میں ایک سٹک گرینیڈ فٹ کر دیا۔ اس کو گڑھے کے اندر رکھا اور پھر دوسرے ڈبے کے پیندے میں سوراخ کیا۔ اس کے اندر سے ایک دھاگہ سٹک گرینیڈ سے جوڑ دیا۔ اس دھاگے کو ایک چھوٹی سی چھڑی سے باندھا اور اوپر والے ڈبے کو مٹی، کنکروں اور لوہے کے ٹکڑوں سے بھر دیا اور ایک دس گز لمبی تار کو سارے نظام سے منسلک کر دیا۔ تار کا کچھ حصہ جان بوجھ کر سڑک پر باہر نکال کر چھوڑ دیا۔ یہ دو منزلہ بارودی سرنگ دفن کر کے اس کے اوپر مٹی ڈال کر جگہ کو دوبارہ پہلے جیسا بنا دیا۔ آدھی رات کے وقت اس کام سے فارغ ہو کر ہم نے سامان اٹھایا اور ندی پار کر کے اپنے علاقے میں پہنچ گئے۔

اگلے دن ہم نے سارے علاقے میں یہ افواہ پھیلا دی کہ مجاہدین نے سری نگر لداخ ہائی وے کے سات مقامات پر بارودی سرنگیں بچھا دی ہیں۔ افواہ سازی کا کام مشکل نہیں تھا۔ اس کے لیے ہمارے ہمدردوں خاص کر سکول کے بچوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ بچوں کی یہ فوج ہمارے لیے اکثر اوقات بہت کار آمد ثابت ہوتی تھی۔ فوج کے مخبر بھی علاقے میں موجود تھے۔ اس لیے یہ ”مصدقہ خبر“ جلد ہی فوج کی ہائی کمان تک پہنچ گئی۔ اس خبر سے فوج کے اندر ہلچل مچ گئی۔ گزشتہ حملوں کی وجہ سے ہم فوج کے اعصاب پر بری طرح سوار ہو چکے تھے۔ اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جنگل میں انہیں اگر کوئی چرواہا بھی نظر آ جاتا تو اسے بھی وہ ”اگروادی“ سمجھ کر ادھر کا رخ کرنے سے کتراتے تھے۔ اس افواہ نے خاطر خواہ کام کیا۔ فوج نے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ ساری سڑک کو محاصرے میں لے لیا اور سڑک پر فوجی

گاڑیوں کی آمدورفت روک دی گئی۔ مجھے وائرلیس سیٹ کے ذریعے فوج کی
بوکھلاہٹ کی اطلاعات موصول ہونے لگیں۔ ہم سب اس سے لطف اندوز ہو رہے
تھے۔

فوج نے سڑک کو جگہ جگہ سے کھود کر بارودی سرنگوں کی تلاش شروع کر دی
۔ جہاں بھی معمولی شک ہوتا وہاں سے سڑک کھودنا شروع کر دیتے، لیکن جب اندر
سے کچھ نہ نکلتا تو اپنا سامنہ لے کر آگے بڑھ جاتے۔ بم ڈسپوزل سکواڈ ان کے ہمراہ
تھا۔ لیکن سڑک کے اس ”پھاڑ“ کی کھدائی کے نتیجے میں کہیں سے کوئی ”چوہا“ بھی
برآمد نہیں ہو پا رہا تھا۔ آخر کار دن دو بجے کے قریب وہ اس مقام پر پہنچے جہاں ہم
نے ان کے لیے پھندا لگایا ہوا تھا۔ ان کے خیال میں شاید یہ جگہ غیر اہم تھی، کیونکہ
چند دن پہلے ہی یہاں ہم دھماکہ کر چکے تھے، اس لیے ان کے نزدیک دوبارہ یہاں
دھماکہ کرنے کا امکان نہ تھا، مگر باہر نکلی ہوئی تار دیکھ کر وہ ہمارے جال میں پھنس
گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ بارودی سرنگ یہیں دفن ہے اور جلدی میں ہم تار کو باہر
رکھنے کی ”غلطی“ کر گئے ہیں۔ اس وقت فوجیوں کے ہمراہ کچھ مقامی افراد بھی تھے۔
فوج ان سے کھدائی وغیرہ کا کام لے رہی تھی۔ بم ڈسپوزل سکواڈ بھی ہمراہ تھا۔
انہوں نے بارودی سرنگ دیکھتے ہی تمام غیر متعلقہ لوگوں کو وہاں سے دور بھیج دیا۔
پھر ایک لمبی تار کو ہماری تار سے جوڑ کر دور لے گئے۔ تقریباً تین سو میٹر کے فاصلے
سے انہوں نے بیٹری کے ذریعے ہماری بارودی سرنگ کو اڑانے کی کوشش کی،
لیکن دھماکہ نہ ہوا۔ متعدد بار انہوں نے مختلف طریقوں سے ٹیج دے کر دھماکہ
کرنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ اس پر انہوں نے سوچا کہ بارودی سرنگ
خراب ہے۔ اب انہوں نے سویلین اور کچھ فوجیوں کو بلایا اور اس جگہ کی کھدائی
شروع کرادی۔ جوں ہی ڈبہ نظر آیا انہوں نے کھدائی کرنے والے مقامی افراد کو

وہاں سے چلتا کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ اس کے متعلق کچھ جان سکیں۔ بم ڈسپوزل سکواڈ کا ایک آدمی ساری کارروائی کی ویڈیو فلم بھی بنا رہا تھا۔ اس ویڈیو فلم کے ذریعے جہاں وہ بارودی سرنگ کی بناوٹ اور ساخت کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے، وہاں افسران اعلیٰ کو اپنا کارنامہ دکھا کر داد و تحسین بھی حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ سویلین کو اس لیے بھی ہٹا دیا تھا تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ یہ عظیم کارنامہ انہوں نے تنہا انجام دیا ہے۔ ورنہ وہ اکثر عام لوگوں کو بارودی سرنگوں کا نشانہ بنا کر اس کا الزام مجاہدین کے سر تھوپتے ہیں۔

بم ناکارہ بنانے والے سکواڈ کے افسران نے بہت احتیاط سے پہلا ڈبہ نکالا۔۔۔ اس کا بغور معائنہ کیا۔ مٹی اور لوہے کے ٹکڑے دیکھے، لیکن انہیں ہماری یہ ”فارسی“ سمجھ نہ آئی۔ انہوں نے آخر کار یہ اندازہ لگا لیا کہ ہم نے تار کو بارودی سرنگ سے باندھ تو لیا لیکن کسی وجہ سے تار کو دور تک نہ لے جا سکے۔ ویڈیو فلم بنانے والے کو اس آخری مرحلے کی کارروائی کو فلم بند کرنے کے لیے چوکنا کر دیا تھا۔ بم ڈسپوزل سکواڈ کے چاروں افسروں نے بڑی احتیاط سے اوپر والا ڈبہ اٹھا رکھا تھا اور فلم بنانے والے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک افسر نے اس مرحلے پر باہر لٹکے ہوئے دھاگے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے کھینچا، دھاگہ کھینچنے کے ساتھ ہی شک گرینیڈ کی پن نکل گئی۔ یہی ہمارا کھیل تھا۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا چاروں افسروں کے جسم ٹکڑوں میں بٹ گئے اور ان کی روحیں عالم بالا کو سدھار گئیں۔ ویڈیو فلم بنانے والا چند گز دور ہونے کی وجہ سے شدید زخمی ہوا۔ قریب کھڑے چند دوسرے فوجی بھی معمولی زخمی ہوئے۔ میں یہ ساری کارروائی دور بین کے ذریعے ایک بلند مقام سے دیکھ رہا تھا۔ ویڈیو کیمرہ اس دھماکے میں سلامت رہا تھا۔ اس لیے فوجی حکام نے اس فلم سے فوٹو لے کر اخبارات کو جاری کیے۔ اگلے

روز یہ فوٹو اخبارات میں شائع ہوئے۔ فوجی حکام نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ”اگر وادیوں کی بچھائی ہوئی انتہائی خطرناک بارودی سرنگ پکڑ لی گئی ہے۔ اپنا جانی نقصان وہ گول کر گئے۔“

اس دھماکے کے بعد فوج نے ہائی وے پر حفاظتی اقدامات مزید سخت کر دیئے۔ اب فوج نہ صرف سڑک پر گشت کرتی بلکہ ارد گرد کے کھیتوں کی بھی تلاشی لی جاتی تھی۔ فوجیوں کے کندھوں پر ہر وقت گنیں لٹکی رہتیں اور ہاتھوں میں لمبے لمبے ڈنڈے ہوتے جن سے وہ زمین اور گھاس میں تاریں تلاش کرتے۔ ان حالات میں ہماری جانب سے کارروائی کے امکانات کم ہو گئے۔ فوجیوں پر فائرنگ کرنا بھی سود مند نہ تھا کیونکہ ایک دوسرے سے وہ بہت فاصلہ رکھ کر چلتے تھے۔

میں نے سوچا ”تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں۔۔۔۔۔۔“ اور پھر قریبی علاقے کی ریکی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ میرے ہمراہ حمزہ سنگریا اور چند مقامی ساتھی تھے۔ دوسرے پاکستانی ساتھی گاندر بل چلے گئے۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے اب کس مقام پر فوجی ہمارا نشانہ بن سکتے ہیں۔ بالاخر روشنی کی ایک کرن نظر آ ہی گئی۔ بن باغ اور ٹھیون کے درمیان سڑک سے چند سو میٹر دور کھیت کے کنارے ایک ٹیکری پر اکثر بھارتی فوجی آکر پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ اس علاقے سے گزرنے والا گاڑیوں کا قافلہ یہاں آکر رک جاتا۔ ٹیکری پر بیٹھے فوجی آگے سڑک کو دیکھتے اور محفوظ ہونے کا اشارہ سیٹی بجا کر یا ہاتھ ہلا کر دیتے، اس کے بعد ہی گاڑیاں آگے بڑھتیں۔ یہ فوجی دستہ قریبی کیمپ سے طلوع آفتاب کے ساتھ نکلتا اور غروب آفتاب تک اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اسی دستے کے ساتھ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ اس فیصلے کے بعد تیاری شروع کر دی۔ اس مرتبہ بھی بارودی سرنگ کے ذریعے ”ایکشن“ کا فیصلہ کیا، لیکن ”طریقہ واردات“ مختلف رکھا۔

میں نے بجلی کا ایک بٹن اور ٹارچ منگوائی۔ بٹن کو لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر فٹ کیا۔ اس کے بعد ٹارچ کے اندر سے وہ فریم نکالی جس میں سیل نصب کیے جاتے ہیں۔ گھی کے ایک ڈبے میں پانچ کلو بارود بھرا اور سیل اس کے اندر فٹ کر دیے۔ ان سیلوں کو تار سے جوڑنے کے بعد بٹن سے جوڑ دیا۔

رات گیارہ بجے کے قریب میں نے پل کے ذریعے ندی کو عبور کیا اور اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں دن کے وقت فوجی آکر بیٹھتے تھے۔ اس جگہ کے بالکل نیچے کھیت میں بارودی سرنگ کو ایک جگہ دفن کیا اور لکڑی کی پلیٹ کو وہاں سے چند میٹر دور اس طریقے سے دفن کر دیا کہ سامنے بیٹھے ہوئے فوجیوں کی اس پر نظر پڑ سکے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں گاؤں میں کھیت کے مالک کے گھر پہنچا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹا کر اسے جگایا اور تاکید کی کہ وہ صبح کام کے لیے کھیت میں نہ جائے۔ ہم نے اسے جان بوجھ کر تفصیل نہ بتائی۔ اس وقت تو اس نے یقین دلا دیا کہ کھیت میں نہیں جائے گا، لیکن صبح اس سے رہا نہ گیا اور وہ ہل چلا نے کھیت میں پہنچ گیا۔ وہ ہل چلا رہا تھا کہ اسے تار دکھائی دی۔ تار دیکھ کر اس کا خیال ہماری طرف چلا گیا اور وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کسان نے فوراً قریب بیٹھے فوجیوں کو اس کی اطلاع کر دی۔ فوجیوں نے بہت احتیاط سے کھیت کی جانچ پڑتال شروع کی۔ اس دوران کسان وہاں سے کھسک گیا۔ چار فوجی لکڑی کی پلیٹ دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ بارودی سرنگ کے دھماکے کا بٹن ہے۔ فوجی گاڑیوں کی آمد میں ابھی وقت تھا، اس لیے انہوں نے سوچا کہ فوراً اس سرنگ کو اڑا دینا چاہیے۔ ان کا خیال تھا بارودی سرنگ سڑک کے درمیان میں نصب کی گئی ہے۔ اب ایک فوجی بڑی احتیاط سے لکڑی کی پلیٹ کو اٹھائے کھڑا تھا۔ سڑک وہاں سے دو سو میٹر دور تھی۔ انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں اور پھر ایک نے بٹن دبایا تو ان کی توقع کے برعکس دھماکہ سڑک پر ہونے

کے بجائے چند قدم کے فاصلے پر ہوا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ چاروں خون میں لت پت فضا میں اچھل کر گرے اور پھر نہ اٹھ سکے۔ میں اس بار بھی سامنے کے جنگل میں آنکھوں سے دور بین لگائے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ باقی فوجیوں نے حسب معمول جنگل کی طرف گولوں اور گولیوں کی بارش شروع کر دی۔ ایک گھنٹے تک انہوں نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اپنے مرنے والے ساتھیوں کا غصہ نکالا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محفوظ مقام پر فوج کی کارروائی کو مانیٹر کر رہا تھا۔

دن کے دو بجے اس علاقے میں فوج کی بھاری نفری کی آمد شروع ہوئی۔ کئی گاڑیاں ابھی آرہی تھیں اور پیدل فوج نے سڑک کے ارد گرد کے سارے علاقے کو محاصرے میں لے رکھا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر سینکڑوں فوجی اپنے چار مرے ہوئے ساتھیوں کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔

طے شدہ فیصلے کے مطابق ہم نے اگلے چند دن خاموشی سے گزار دیے۔ رات کو جنگل میں سوتے اور دن کے وقت گاؤں گاؤں پھرتے۔ ہم چند ساتھی اس ”ویرانے“ کو آباد کیے ہوئے تھے۔ وادی کے مجاہدین سے صرف وائرلیس کے ذریعے ہمارا رابطہ تھا۔ انہیں ہماری کارگزاری کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی طرف سے دادو تحسین کے جملے بھی ہوا کہ دوش پر سیٹ کے ذریعے مل جاتے تھے۔ وادی کے اخبارات میں ہماری کارروائیوں کی رپورٹیں شائع ہو رہی تھیں۔ اس طرح اس تنگ درے میں فوج جس عذاب میں مبتلا تھی، اس کی بازگشت وادی کے بلند و بالا پہاڑوں سے نکل کر ہندوستان بھر میں سنائی دینے لگی۔ بھارتی فوج کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ہم سے کس طرح چھٹکارا پائے۔ جنگل میں ہمارے ٹھکانوں تک پہنچنا تاواں دل ہندو فوجیوں کے بس میں نہیں تھا۔ ایک ہی راہ تھی کہ ہمارے ٹھکانوں پر جہازوں سے بمباری کی جائے، لیکن وسیع رقبے پر پھیلے

ہوئے اس گھنے جنگل میں ٹھیک ٹھیک نشانے پر بمباری کرنا بھی بھارتی فضائیہ کے لیے ممکن نہ تھا۔ ایک آدھ مرتبہ بھارتی طیاروں اور ہیلی کاپٹروں نے جنگل میں ہمیں تلاش کرنے کی کوشش ضرور کی لیکن گھنا جنگل ہمیں آغوش مادر کی طرح چھپائے رہا۔

ان کارروائیوں کے دوران کنگن کے غیور لوگوں نے جس جذبے اور بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ کنگن میں بڑھتی ہوئی کارروائیوں کے ساتھ ہی لوگوں پر بزدل فوج کی طرف سے مظالم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ حالانکہ ان معصوم اور بے گناہ لوگوں کا ہمارے کام میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ ہم ان سے کچھ پوچھتے تھے نہ بتاتے تھے، اس لیے کہ ہمارے مشن کا تقاضا یہی تھا۔ فوجی بچوں اور نوجوانوں کو تشدد کا نشانہ بناتے اور پوچھتے، یہ دھماکے کس نے کیے ہیں، تو وہ کہہ دیتے یہ کارروائیاں شاہین بھائی کرتا ہے۔ اسے تلاش کر کے اس سے جواب طلبی کریں۔۔۔ ہمیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ لیکن قصاب صفت بزدل فوجیوں پر دلائل اثر نہیں کرتے تھے۔ وہ سارا غصہ ان ہی پر نکالتے تھے۔ جس گاؤں سے فوجی دہشت گردی کی خبر آتی، میں موقع ملنے پر وہاں ضرور جاتا، لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کی ہمت بندھاتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنا غم بھول جاتے اور کہتے ہماری فکر نہ کریں، لیکن بھارتی فوج کی ”فکر“ ضرور کریں۔ میں انہیں کہتا۔۔۔۔۔ ”آپ دعا کرتے رہیں۔ اگر اللہ کی مدد شامل حال رہی تو بھارتی فوجی میرا نشانہ بنتے رہیں گے۔“

میرا یہ معمول تھا کہ سرشام جب فوج اپنے اپنے کیمپوں کو لوٹ جاتی تو میں ایک آدھ ساتھی کے ہمراہ ان مقامات کو جا کر غور سے دیکھا کرتا تھا جہاں جہاں وہ دن بھر رہتے تھے۔ میں مطالعہ کرتا کہ فوجی فلاں مقام پر کیوں بیٹھے۔۔۔؟ کیا کرتے

رہے۔۔۔۔؟ کھانا کہاں کھایا۔؟ چائے کہاں پی۔۔۔۔؟.... وغیرہ۔ اور پھر کون کون سے مقامات ایسے ہیں جہاں وہ بلا ناغہ بیٹھتے ہیں۔ روز مرہ کے معمولات سے آگاہی کی وجہ سے کارروائی کی منصوبہ بندی کرنے میں بڑی آسانی رہتی ہے۔

بن باغ سے سری نگر کی جانب جائیں تو تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اخروٹ کا ایک بہت بڑا اور سایہ دار درخت آتا ہے۔ گرمی کے ایام میں لوگ اس کے سائے میں بیٹھتے ہیں۔ قریب ہی نالہ سندھ بہتا ہے۔ بھارتی فوجی بھی اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر چائے بناتے، کھانا وغیرہ گرم کرتے اور سستاتے تھے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ فوجی ہر روز وہاں آکر چولہا گرم کرتے ہیں تو میں نے کارروائی کا پروگرام بنالیا اور ایک رات منصوبے کو حتمی شکل دی۔ میں نے چھ کلو بارود، دو کلو کوئلہ، راکھ، سیفٹی فیوز، پٹرول کی ایک بوتل اور چند ساتھی ہمراہ لیے اور رات کے بارہ بجے اخروٹ تلے پہنچ کر اپنی کارروائی شروع کر دی۔

اس رات چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب سے آسمان کی وسعتوں میں چمک رہا تھا، سارے علاقے پر سناٹا طاری تھا، لوگ گھروں میں سوئے ہوئے تھے اور ہم ”اللہ کے مزدور“ رات کے ”اوور ٹائم“ پر نکلے ہوئے تھے۔ گینتی اور بیلچے کے علاوہ ہمارے پاس چند خالی بوریاں بھی تھیں۔ سب سے پہلے چولہے کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا۔ جو پتھر جس جگہ پر رکھا گیا تھا، اٹھانے سے پہلے اس کی پوزیشن یاد کر لی گئی۔ اس کے بعد ساتھیوں سے کہا کہ بڑی احتیاط سے پتھروں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں۔ پھر چولہے کی راکھ کو اکٹھا کر کے ایک طرف رکھا۔ اس کے بعد بوریاں چولہے کے ارد گرد بچھا دیں۔ اب چولہے کی جگہ کی کھدائی شروع کی گئی۔ کھودی ہوئی مٹی کو بیلچوں کی مدد سے بڑی احتیاط سے بوریوں کے اوپر ڈالا جانے لگا۔ جب گڑھے کی گہرائی تین فٹ ہو گئی تو میں نے بارود کو سب سے نیچے دفن کیا۔ اس

کے ساتھ سیفٹی فیوز لگا کر کچھ مٹی ڈال کر اس کے اوپر کوئلہ بکھیر دیا۔ آٹھ انچ کے لگ بھگ سیفٹی فیوز میں نے اوپر نکال دیا۔ اب میں نے کوئلہ پیس کر اسے راکھ میں ملایا اور چولہے کے اندر چاروں جانب بکھیر دیا یہاں تک سیفٹی فیوز غائب ہو گیا۔ اس کے بعد پٹرول چھڑک کر اس کے اوپر چولہے کی راکھ بکھیر دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد پتھروں کو انتہائی احتیاط سے ان ہی جگہوں پر رکھ دیا جہاں سے اٹھائے گئے تھے۔ مٹی کو ہم نے وہاں سے دور لے جا کر پھینک دیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں نے چولہے کا دوبارہ جائزہ لیا۔ اس میں سرمو تبدیلی نظر نہ آئی۔ اس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ بوریاں ہم نے سندھ ندی کی نذر کیں۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی جس وقت ہم جنگل میں واپس داخل ہو رہے تھے۔

اگلے دن دس بجے کے قریب میں دور بین لے کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جنگل میں ایک اونچے مقام پر اپنے ”ڈرامے“ کا ڈراما سین دیکھنے پہنچ گیا۔ دور بین کے ذریعے یہ مقام واضح نظر آ رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد تیز دھوپ کی وجہ سے سارے فوجی سمٹ کر درخت کے سائے تلے بیٹھ گئے۔ دو فوجیوں نے کھانا گرم کر کے دیگر فوجیوں کو پلیٹوں میں ڈال کر دیا۔ فوجی کھانا کھانے لگے اور چولہے پر چائے چڑھا دی گئی۔ اس وقت تک چولہا اچھی طرف گرم ہو چکا تھا۔ سیفٹی فیوز کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ فوجیوں نے ابھی آدھا کھانا ہی کھایا تھا کہ زوردار دھماکہ ہوا۔ کھانا کھانے والے ایک درجن کے قریب فوجی فضا میں اچھلے اور سب لقمہ اجل بن گئے۔ زوردار دھماکہ سے اخروٹ کا درخت بھی ایک طرف جھک گیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کامیابی پر اللہ کا شکر ادا کیا اور ساتھیوں کے ہمراہ نزدیکی گاؤں کا رخ کیا۔

یہ جولائی ۱۹۹۴ء کے آخری دن تھے۔ سری نگر لداخ روڈ پر ہم نے بھارتی فوج

کو بری طرح خوف زدہ کر دیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ اپنے سائے کو بھی مجاہد سمجھنے لگے تھے۔ ہم اپنی حکمت عملی میں بڑی حد تک کامیاب تھے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ فوج کو نہ صرف زیادہ سے زیادہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا جائے بلکہ اسے اعصابی تناؤ کا بھی بری طرح شکار کیا جائے۔ ہماری اس حکمت عملی کے خاطر خواہ نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے۔ بھارتی فوجی بجھے بجھے سے نظر آنے لگے، خوف کے سائے ان کے چہروں پر لہرا رہے ہوتے تھے۔ یکے بعد دیگرے حملوں نے بھارتی فوج کو نقل و حرکت بھی تیز کرنے پر مجبور کر دیا۔ کنگن کے علاقوں میں دن بھر فوج کی نقل و حرکت دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بڑی جنگ چھڑنے والی ہے۔ فوجی گاڑیاں سارا دن ادھر ادھر بھاگتی رہتی تھیں، سڑک کے کناروں پر مختلف مقامات پر دن کے وقت بھاری گنیں نصب کر دی جاتی تھیں۔ اب تو حالت یہ تھی کہ سڑک کے کنارے ہر دو میٹر پر ایک بھارتی فوجی گھات لگائے دن بھر بیٹھا رہتا۔ مجھے اس طرح کے فوجی اقدامات کا احساس تھا اور میں فوج کو اسی مقام پر لانا بھی چاہتا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف میں فوجیوں کی بھاری تعداد نے ہمارے لیے یہ ممکن بنا دیا تھا کہ اب ہم اپنے ٹھکانوں سے بیٹھے بٹھائے ان فوجیوں کو نشانہ بنائیں لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہمارے پاس کوئی بھاری گن نہیں تھی، تاہم گن کے حصول کے لیے ہم کوشاں تھے۔

ایک دن غروب آفتاب کے بعد میں مجاہدین کے ہمراہ گٹل باغ جا رہا تھا۔ راستے میں وہ جگہ بھی پڑتی تھی جہاں ہم نے ایک کامیاب کارروائی کی تھی۔ فوج نے حفظ ماتقدم کے طور پر اب سڑک کے کنارے ٹیکری پر بیس پیچتیس فوجیوں کا ایک دستہ مستقل تعینات کر دیا تھا۔ یہ دستہ صبح یہاں آ کر حفاظتی ذمے داری سنبھال لیتا اور سرشام واپس لوٹ جاتا۔ قریب ہی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھی تھا جس کی

حفاظت کا کام بھی یہ دستہ سرانجام دیتا تھا۔ میں مجاہدین کے ہمراہ جب ٹیکری کے قریب سے گزرا تو زمین پر نظر پڑی، وہاں چولہا بنا ہوا تھا اور زمین پر پڑی ہوئی دیگر اشیاء بھی بھارتی فوجیوں کے یہاں آنے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ میرے پاس اس وقت چند اینٹی پرسنل مائنز تھیں۔ میں نے فوراً خنجر نکالا اور چولہے سے دوفٹ کے فاصلے پر پاؤں کے سائز میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھودا۔ اس کے بعد انتہائی مہارت سے مائن کو اس میں فٹ کر کے فیوز لگایا اور پھر مٹی دوبارہ اس طرح ڈال دی جیسے پہلے تھی۔ یہ کام کر کے میں ساتھیوں کے ہمراہ آگے روانہ ہو گیا اور شام کو ہم اپنے ٹھکانے پر واپس آ گئے۔ اگلے دن مجھے خبر ملی کہ ایک فوجی کا پاؤں اس مائن پر پڑنے سے اڑ گیا ہے۔ اگرچہ یہ بہت بڑی کارروائی نہیں تھی، لیکن یہ ہماری اس حکمت عملی کا حصہ تھا جس کے تحت ہم بھارتی فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔ اس چھوٹے سے واقعے نے ان کو سڑک کے علاوہ کھیتوں، کچے پکے راستوں، منڈھیروں اور پگڈنڈیوں پر بھی پھونک پھونک کر قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ساتھ ہی میں نے گاؤں کے بچوں کے ذریعے یہ افواہ بھی عام کر دی کہ اب مجاہدین فوجیوں کے گزرنے والے عام راستوں پر بھی سرنگیں بچھا رہے ہیں۔ پہلے سے ہر اس فوجیوں کے اعصاب پر یہ ایک اور ضرب تھی۔ اس اعصابی جنگ میں ہمارا پلہ بہت بھاری رہا اور فوجی کم خوابی کا شکار ہونے لگے۔ بھارتی فوجیوں کی ان کمزوریوں اور پریشانیوں کا ہمیں اپنے ذرائع سے پتا چلتا رہا۔

گاندربل گونج اٹھا

گٹل باغ سے واپسی پر ہم پرنگ کے علاقے میں چند دن تک رہے۔ حمزہ سنگریار کے علاوہ بارہ مقامی مجاہدین بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ان میں سے ایک کا نام سمیر خان تھا۔ سمیر خان پشتو بولنے والے مقامی ساتھی تھے۔ چند دن بعد ہم سب بخون کے علاقے میں چلے گئے۔ بخون میں ہمیں بہت سے دوسرے مقامی مجاہدین مل گئے۔ ان میں جاوید خان اور نذیر قابل ذکر ہیں۔ مقامی مجاہدین کا پہلا گروپ ہمیں یہاں چھوڑ کر واپس اپنے علاقے میں چلا گیا۔ حمزہ سنگریار نے عبدالرحمان بھائی کے پاس جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بخون میں ہی حافظ منشا قمر بھی ہم سے آ ملے۔ میں نے حمزہ بھائی کی خواہش کے پیش نظر انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ عبدالرحمان بھائی لانچنگ کے کام کے سلسلے میں سری نگر میں سرگرم عمل تھے۔ اب حمزہ بھائی کا کام حافظ منشا قمر نے سنبھال لیا۔ ہمارے پاس اب گئے چنے چند راؤنڈ اور دوسری اشیاء رہ گئی تھیں۔ ہمیں ایک سنائپنگ گن کی بھی اشد ضرورت تھی۔ ایمونیشن اور یہ گن حاصل کرنے کے لیے ہمیں منی گام جانا تھا۔

بخون میں چند دن ٹھہرنے کے بعد ایک روز ہم نے رات کے وقت نالہ سندھ

کو عبور کیا اور فوجی کیمپ کے قریب سے ہوتے ہوئے سامنے کے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ ایک دن کے سفر کے بعد ہم منی گام پہنچے۔ منی گام میں مجاہدین کے ایک گروپ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہمارا خیر مقدم اور قیام و طعام کا بندوبست کیا۔ یہاں مطلوبہ اشیاء ملنے کے امکانات معدوم تھے، چنانچہ ایک دن کے قیام کے بعد میں وہاں سے ساتھیوں کے ہمراہ گاندر بل کے علاقوں و ت لار، وارسو اور سنگرامہ چلا گیا۔ گاندر بل میں مقامی مجاہدین نے مجھے سفر کے لیے ایک ماروتی کار پیش کی۔ میں اس کار میں یں ہامہ، وارسو، کہہ ہامہ، وارسو، اٹھ پورہ اور چھندن سمیت بہت سے علاقوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ ست پال کے قتل کے بعد میں کنگن چلا گیا تھا اور اب چھ ماہ بعد یہاں آیا تھا۔ درمیان میں کچھ ہی دنوں کے لیے گاندر بل آیا تھا۔ گاندر بل کی فضا اب بدلی بدلی نظر آتی تھی۔ ست پال کی زندگی میں یہاں فوج کا راج تھا اور اب واضح طور پر یہاں مجاہدین کی حکومت ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ فوج کیمپوں میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ مجاہدین ٹرکوں اور دوسری گاڑیوں میں کھلے عام بازاروں اور سڑکوں پر گتیں لیے پھرتے، لیکن فوج ان سے الجھنے سے دامن بچاتی۔ چند دن تک میں گاندر بل کے مضافاتی قصبوں میں خوب گھومتا پھرتا رہا، اس کے بعد گاندر بل آ گیا۔ گاندر بل میں ہی افغان مجاہد عبدالقیوم بدخشانی سے ملاقات ہوئی۔ عبدالقیوم بدخشانی کافی عرصے سے سوپور میں محو جہاد تھے۔ اس دوران انہوں نے کنگن میں ہماری کارروائیوں کی بازگشت سنی تو کنگن آنے کی خواہش ان کے اندر کلبلا نے لگی۔ لیکن ان کے پاس کوئی بڑا ہتھیار نہ تھا جس سے وہ کنگن میں کوئی معرکہ سر کر سکتے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان سے پیکاگن یا گرینیڈ تھرور لے کر کنگن جاؤں گا۔ اب وہ پاکستان سے واپس آئے تھے۔ ان کے ساتھ پاکستانی مجاہدین کا ایک گروپ تھا۔ یہ گروپ سری نگر عبدالرحمان بھائی کے

پاس چلا گیا تھا۔ قیوم بد خشتانی علالت کی وجہ سے اس گروپ کے ساتھ سری نگر نہیں جاسکے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ قیوم بد خشتانی کم عمر لیکن جہاد کی اصل روح سے واقف تھے۔ بھارتی فوج سے لڑنا اور ان کے لاشے گرانہ ان کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ میرے پاس کنگن پہنچنے کے لیے بے چین تھے۔ گاندر بل میں قیوم بد خشتانی تین دن ہمارے ساتھ رہے۔ ان تین دنوں میں ہی وہ شہر بھر میں معروف ہو گئے۔ ہر شخص اس کم عمر مجاہد میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ علی الصبح موٹر سائیکل لے کر نکل جاتے اور شام کے وقت واپس لوٹتے۔ ان کے شب و روز دیکھ کر ہر ملنے والا شخص ان سے کہتا کہ احتیاط سے کام لیں۔ بھارتی فوج کسی وقت بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے، لیکن وہ تو خوف و ہراس سے ماورا تھے۔ ان کا بس ایک ہی جواب ہوتا تھا۔۔۔ ”میں نے شہید ہونا ہے اور اسی میں میری کامیابی ہے۔“

ان تین دنوں میں ہم فوج کی نقل و حرکت اور معمولات کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے رہے۔ ہماری خواہش تھی کہ فوج کے خلاف ایک کارروائی ضرور کی جائے تاکہ فوج پر پہلے سے موجود خوف کو مزید گہرا کیا جاسکے۔ فوج پر کاری ضرب لگانے کے لیے تین دن تک مشورے ہوتے رہے اور بالا آخر ہم نے ایک حتمی منصوبہ تیار کیا، جس پر چوتھے روز عمل کرنا تھا۔

چوتھے روز مقامی مجاہد محمدی بھائی کو ہم نے صبح سویرے ایک ٹرک لانے کے لیے اڈے کی طرف روانہ کیا۔ فوج کے کیمپ وہاں سے کافی دور تھے، اس لیے ہمارا پروگرام تھا کہ ٹرک میں بیٹھ کر جائیں گے اور کیمپ پر حملے کے بعد محفوظ طرف نکل جائیں گے۔ محمدی بھائی خفیہ ٹھکانے سے باہر نکل کر سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ انہیں سامنے سے فوجی گاڑیوں کا ایک ریلہ آتا دکھائی دیا۔ انہیں دیکھ کر محمدی بھائی

بن چکا تھا۔ میں نے فوراً گاڑی کو ہاتھ کے اشارے اور اونچی آواز میں آگے آنے کا کہا۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ انہیں شاید لمحے بھر کے لیے بھی احساس نہیں ہوا ہو گا کہ یہ بھارتی فوجی ہے، پھر پیکا گن مجاہدین کی سب سے بڑی شناخت تھی۔ لیکن گاڑی میں بیٹھے ہوئے فوجی افسر اتنے بے بس تھے کہ انہیں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کریں۔ یہی وجہ ہے جوں ہی میں نے انہیں آگے آنے کا کہا تو ڈرائیور بلا چون و چرا گاڑی میری طرف چلانے لگا۔ اس کے ہمراہ بیٹھے ہوئے فوجی افسر مبہوت ہو کر میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے۔

گاڑی مجھے سے دو گز کے فاصلے پر دوبارہ رک گئی۔ میں آگے بڑھا، پیکا کی سیفٹی اتار کر میں نے ایک پاؤں گاڑی کے بونٹ پر رکھا، گاڑی کے منہ پر پیکا کو نصب کیا۔ چند لمحے تک میں بھارتی فوجی افسروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا۔ فرنٹ سیٹ پر ایک فوجی کرنل بیٹھا ہوا تھا، جب کہ باقی افسر پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں موت کے سائے لہرا رہے تھے۔ ان کے چہرے زرد، منہ کھلے ہوئے اور ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ وہ ہلنے جلنے کی قوت سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے مجھے دیکھتے رہے۔ فوجی تربیت کے دوران انہیں اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے گر اگر سکھائے بھی گئے تھے تو ان کو آزمانے کے لیے جس دل اور گردے کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھے۔ ان کے پیچھے فوجیوں سے بھرا ٹرک آ رہا تھا لیکن وہ ابھی موڑ کی دوسری طرف نظروں سے اوجھل تھا۔

یہ چند لمحوں کی کہانی ہے۔ میں نے چند فٹ کے فاصلے سے گاڑی میں موجود تمام فوجی افسروں پر پیکا کا برسٹ مار کر انہیں بھون ڈالا۔ گولیاں گاڑی کے شیشوں کے اس پار سڑک کے کنارے مکانوں کی دیواروں اور کھڑکیوں میں بھی سوراخ کر

گئیں۔ یہ نشانات آج بھی اس کارروائی کی یادیں تازہ کرنے کے لیے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان ہلاک ہونے والوں میں ست پال کی جگہ آنے والا فوجی کرنل، اس کا ڈپٹی میجر اور تین کیپٹن تھے۔ گاڑی کا ڈرائیور اور ایک فوجی حوالدار بھی اپنے افسروں کے ہمراہ داخل جہنم ہوئے۔ یہی کرنل اس کریک ڈاؤن کا انچارج تھا۔

میں نے بونٹ سے قدم نیچے رکھا ہی تھا کہ گاڑی کے عقب سے فوجی ٹرک نمودار ہوا۔ میں نے پجیرو کی آڑلی اور گاڑی کے پیچھے ایل ایم جی لیے کھڑے فوجی کے سینے پر دو فائر داغ دیے، وہ وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا گولیوں کی گھن گرج سے گونج اٹھی۔ ٹرک کے فوجیوں کو ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ فائر کہاں سے آیا ہے۔ اس دوران دو فوجی کسی پچھلی گاڑی سے اترے اور موٹر کاٹ کر پجیرو گاڑی کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ قبل اس کے کہ وہ آگے بڑھ کر مجھے گولی کا نشانہ بناتے، میری پیکا نے دو شعلے اگلے اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے۔

فضا میں کبھی ایک طرف سے ترڑ ترڑ.... ترڑ کی آواز گونجتی تو کبھی دوسری طرف سے کوئی خوفناک دھماکہ سنائی دیتا۔ اس گھن گرج میں اب مقامی آبادی کی چیخیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ میں ابھی تک گاڑی کے اگلے حصے کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، اس لیے فوجیوں کی نظروں سے اوچھل تھا۔

میرے پیچھے ایک چوک تھا، اچانک میری نظر اس طرف پڑی۔ بکتر بند گاڑیوں کا ایک کانوائے اس چوک سے گزر کر بڑی تیزی سے کسی دوسری سمت جا رہا تھا۔ یہ بہت بڑا کریک ڈاؤن تھا اور چاروں اطراف سے سینکڑوں فوجی گاڑیاں ہمیں گھیرنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھیں۔ بعد میں مجھے جو تفصیلات ملیں ان کے مطابق ان بکتر بند گاڑیوں کا رخ میرے ساتھیوں کی طرف تھا۔ وہ اب چھپے چھپاتے

مجھ سے ایک کلومیٹر دور ایک دوسری سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ وہاں سے وہ قریب کے اس جنگل میں داخل ہونا چاہتے تھے جہاں کبھی ست پال کے قتل کے لیے میں بچوں کو تربیت دیا کرتا تھا۔ حافظ منشا قمر، قیوم بدخشانی اور جماعت اسلامی کے مقامی رہنما منظور صاحب جنگل میں داخل ہونے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ مقامی مجاہد ان سے الگ ہو کر کسی دوسری طرف نکل گیا تھا۔ ایک گلی سے ان تینوں نے سڑک عبور کر کے سامنے ایک دوسری گلی میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ وہ سڑک پر ہی تھے کہ ایک بکتر بند گاڑی بیس گز کے فاصلے سے ایک موٹر گاڑی کے ساتھ آگئی۔ اس پر ایک فوجی مشین گن لیے کھڑا تھا۔ اس نے جوں ہی ان کو دیکھا، لمحوں میں ان پر کئی برسٹ داغ دیے۔ حافظ منشا قمر، قیوم بدخشانی اور منظور صاحب موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ بکتر بند گاڑی اتنی اچانک سامنے آئی تھی اور پھر اتنی تیزی سے فوجی نے فائرنگ کی کہ ان کو اوٹ لینے یا پوزیشن سنبھالنے کا موقع تک نہ مل سکا۔ فوجیوں نے ان مجاہدین کا اسلحہ اور وہ سنائپنگ گن بھی قبضے میں لے لی، جو ہم نے کنگن لے جانے کے لیے حاصل کی تھی۔

آدھ گھنٹے تک میں پجیرو کے نیچے پوزیشن لیے فوجیوں کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ فائرنگ کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس طرف کوئی نہ آیا تو میں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا اور اس کے بعد چھلانگ لگائی اور سڑک کے کنارے پتھروں کی اوٹ میں چلا گیا۔ چند منٹ تک گن تان کر میں ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر میں نزدیکی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی آگے جا کر اس موٹر کے پاس کھلتی تھی جہاں فوج کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ باہر نکلنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سڑک پر ہر طرف فوجی گاڑیاں ہی نظر آرہی تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ سڑک عبور کر کے سامنے کے کھیتوں میں چلا جاؤں۔ وہاں سے قریبی جنگل کی

طرف ٹکنا ممکن تھا۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے اس گلی کی نکل پر پہنچا۔
 کیا دیکھتا ہوں سڑک پر ایک فوجی ٹرک کے نیچے آٹھ سپاہی لیٹے ہوئے ہیں اور
 سامنے کی طرف اندھا دھند فائرنگ کر رہے ہیں۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی اس
 لیے مجھے انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سڑک کے کنارے ایک ٹوٹی پھوٹی
 دیوار کی آڑ میں پوزیشن لی اور پیچھے سے ان فوجیوں پر پیکا کا برسٹ داغ دیا۔ چند
 فوجی وہاں تڑپنے لگے۔ اب میں نے دوڑ لگا دی۔ دشمن کی گولی کہیں سے بھی آکر
 میرا کام تمام کر سکتی تھی، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اللہ نے مدد کی
 اور دشمن کی نظریں مجھ پر نہیں پڑیں اور میں دو سو گز کے فاصلے پر دہان کے ایک
 کھیت میں داخل ہو گیا۔ کھیت میں چاول کی فصل دو دو فٹ اونچی تھی، لیکن پانی کھڑا
 ہونے کی وجہ سے چلنا دو بھر تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ میرے پاس اپنی پیکا گن اور پوچ
 کے علاوہ حافظ منشا قمر کا پٹھو اور گرینیڈ بھی تھے۔ یہ سارا وزن بیس کلو سے زائد ہو
 گا۔ گرتے پڑتے میں نے چند کھیتوں کو عبور کیا اور نزدیکی گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں
 چند لمحے رک کر ایک چھوٹے سے لڑکے سے پانی منگوا کر پیا اور پھر جنگل کی طرف
 روانہ ہو گیا۔ میرے آگے آگے سینکڑوں افراد جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ گاؤں
 سے باہر دور سے مجھے ایک مقامی ساتھی سردار خان جاتے دکھائی دیے۔ میں نے
 انہیں آوازیں دیں، لیکن فائرنگ کی شدت کی وجہ سے وہ میری آواز نہ سن سکے۔
 جنگل میں پناہ لینے کے لیے جانے والے چند نوجوانوں کو میں نے روک کر بوجھ
 ہلکا کرنے کے لیے پٹھو دے دیا۔ ان دنوں کشمیر میں موسلا دھار بارشیں ہوئی تھیں
 جس کی وجہ سے ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ میرے کپڑے کچھڑ سے لت پت تھے اور
 بوٹوں میں بھی کچھڑ بھر گیا تھا۔ میں چند مقامی نوجوانوں کے ہمراہ راستے میں پڑنے
 والے تین شوریدہ سر نالے بھی عبور کیے۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں ایک

دوسرے گاؤں کے کنارے پہنچا۔ قریب ہی ایک کشتی میں خواتین کپڑے دھو رہی تھیں۔ انہوں نے جوں ہی مجھے دیکھا لپک کر میری طرف آئیں۔ یہ مجھے پہلے سے جانتی تھیں۔ ست پال کے قتل کے بعد مردوں کی طرح بہت سی خواتین بھی مجھے دیکھنے کے لیے آئیں اور گہری عقیدت کا اظہار کرتی تھیں۔ یہ خواتین بھی ست پال کے قتل کی وجہ سے مجھ سے متعارف ہوئی تھیں۔ انہوں نے فوراً مجھ سے میرا سامان لے کر کشتی میں رکھ دیا۔ سردار خان بھی بھگتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ ہم سب کشتی میں بیٹھ گئے۔ خواتین نے کشتی کے ملاح کو بلا بھیجا اور اسے حکم دیا کہ ہمیں پار پہنچا دے۔

کشتی کے ذریعے میں چھندن کے علاقے سے نکل کر اٹھ پورہ پہنچ چکا تھا۔ برسات اپنے عروج پر تھی۔ گزشتہ چند دنوں کی بارشوں کی وجہ سے سارے علاقے میں پانی کھڑا تھا۔ عام دنوں میں اس وسیع و عریض جنگل میں دلدل ہوتی تھی، لیکن بارش ہونے کی صورت میں پانی اتنا زیادہ کھڑا ہو جاتا تھا کہ کشتیوں کے ذریعے ہی سفر ممکن ہوتا تھا۔ درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں چھپنے کی جگہ بھی تھی۔ میری یہاں موجودگی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر سو پھیل گئی۔ ایک جگہ ہم ٹھہرے تو چند کشتیاں ہمارے پاس آ کر رکیں۔ اس میں مرد اور خواتین تھیں۔ انہوں نے چائے اور کھانے کی اشیاء لائی تھیں۔ جماعت کے ایک مقامی ذمہ دار بھی وہاں آ پہنچے۔ نالہ سندھ یہاں سے قریب ہی ایک مقام پر دریائے جہلم میں گرتا تھا۔ اس وجہ سے علاقے میں آمد و رفت کا بڑا ذریعہ کشتیاں ہی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ میرے ہمدردوں نے بھی کہا کہ بھارتی فوج موٹر بوٹوں کے ذریعے آپ کو یہاں تلاش کرے گی، اس لیے

فوراً ٹکنا ہی بہتر ہے۔ میں نے سردار خان کو ساتھ لیا اور کشتی کے ذریعے خشکی پر پہنچا۔ قریب ہی سے ایک سڑک واکپورہ کو جاتی تھی۔ ہم دونوں کشتی سے اتر کر سڑک کے کنارے ایک درخت کی اوٹ میں سواری کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔ پندرہ منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد دور سے ایک سکوتر آتا دکھائی دیا۔ جیسے ہی وہ قریب آیا میں نے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ مجھے دیکھتے ہی سکوتر سوار لرز گیا۔ اس کے حواس بحال ہونے سے قبل ہی میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور چلنے کو کہا۔ سردار خان کے لیے چونکہ سکوتر پر جگہ نہیں تھی اس لیے میں نے پیکا کے علاوہ سارا سامان اسے دیا اور جنگل کی طرف چلے جانے کا کہا۔

سکوتر والے نے ہماری گنیں دیکھیں تو خوف زدہ ہو گیا اور حیلے بہانے شروع کر دیے۔ وقت بہت قیمتی تھا، کسی وقت بھی فوج آکر ہمیں گھیر سکتی تھی۔ میں نے اسے پہلے پیار سے، پھر دلائل سے اور آخر کار دھمکی سے چلنے پر آمادہ کر لیا۔ ہمارا رخ واکپورہ کی طرف تھا۔ سکوتر سوار ابھی تک سنبھلا نہیں تھا۔ مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں یہ حادثہ ہی نہ کر بیٹھے۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی، تو اس کے حواس قدرے بحال ہوئے۔ اب وہ بڑی تیزی سے سکوتر چلا رہا تھا۔ چند کلومیٹر کا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ سامنے سے فوج کی چند گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ سب سے آگے ایک جیپ تھی اور اس کے پیچھے ایک ون ٹن گاڑی تھی۔ ہمارا ان سے فاصلہ محض چند سو گزر رہ گیا۔ سکوتر چلانے والے کی نظرجوں ہی فوجی گاڑیوں پر پڑی تو کانپتے ہوئے اس نے پیچھے مڑ کر کہا۔ ”بھائی مارے گئے۔۔۔۔۔“

میں نے سکوتر والے سے کہا۔۔۔۔۔ ”ہمت نہیں ہارنا اور سکوتر سڑک پر ہی چلاتے رہنا۔“

میں نے پیکا کی سیفٹی چڑھائی ہوئی تھی۔ سیفٹی میں نے اس لیے نہیں اتاری

تھی کہ جھٹکے لگنے سے خطرہ تھا کہ اچانک گولی نہ چل جائے۔ میں ضرورت پڑنے پر کارروائی کے لیے تیار تھا۔ سکوٹر والا بھی سخت گھبرایا ہوا تھا اور اونچی آواز میں دعائیں مانگ رہا تھا، تاہم اس کی سکوٹر پر گرفت کمزور نہیں ہوئی تھی۔ پھر آنا "فانا" یہ لہراتی ہوئی گاڑیاں ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گاڑیاں اپنی اڑائی گرد میں غائب ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھ کر سکوٹر والے نے بلند آواز میں اللہ کا شکر ادا کیا اور ہم قدرے اطمینان سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگے۔

واکپورہ پہنچ کر میں نے مقامی نظم سے رابطہ قائم کیا اور انہیں ساتھیوں کی شہادت سے مطلع کیا۔ حزب المجاہدین کے مقامی نظم نے فوری طور پر پولیس سے رابطہ کر کے لاشیں وصول کرنے کا اہتمام کیا۔ مقامی مجاہد ساتھی جہانگیر اس کام میں سرگرم ہو گئے۔ فوج نے چھندن کے علاقے کا وسیع پیمانے پر محاصرہ کر رکھا تھا، اس لیے میرے لیے وہاں جانا سردست ممکن نہیں تھا۔ دن کا باقی حصہ میں نے واکپورہ میں ہی ایک کمین گاہ میں گزارا۔ عشاء کے وقت پولیس کے ذریعے شہید ساتھیوں کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ اگلے روز دن بھر فوج کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا، ورنہ دل تو چاہتا تھا کہ اڑ کر وہاں پہنچوں جہاں میرے جانباز سچیلے ساتھیوں نے اپنا پاک و مقدس خون گرایا ہے۔ اپنی آنکھوں سے اس خاک کو بوسے دوں، جہاں انہوں نے اللہ کی عظمت کی گواہی دیتے ہوئے اپنی آخری سانسیں لی ہیں۔ لیکن ابھی تک ظالم سپاہ نے پورے علاقے کا شدید محاصرہ کیا ہوا تھا۔ بالآخر خدا خدا کر کے شام کے پانچ بجے فوج کی واپسی کی اطلاع ملی۔ ڈپٹی کمپنی کمانڈر جمیل بھائی بھی فوج کی واپسی کے منتظر تھے، اطلاع ملتے ہی انہوں نے سکوٹر لیا اور مجھے لے کر چھندن کی طرف روانہ ہو گئے۔ سب سے

پہلے ہم اپنے ساتھیوں کی جائے شہادت پر پہنچے، ان کا خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا، مقامی لوگوں نے عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے ان کشتگان وفا کے لہو پر ان گنت پھول بکھیر دیے تھے اور فضا میں ان کے خون کی خوشبو کے ساتھ ساتھ ان پھولوں کی خوشبو بھی رچی بسی ہوئی تھی۔ تینوں شہیدوں کی لاشیں فوج اٹھا کر لے گئی تھی۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ ”بہادر سپاہ“ نے اپنے انتقام کی آگ کو شہیدوں کے لاشوں پر بجھایا، ان کی بے حرمتی کی گئی، لیکن حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی عظیم المرتبت والدہ کے بقول۔۔۔۔۔ ”جب بکری ذبح ہو جائے تو اسے کیا پروا کہ کھال کیسے اتری ہے؟“

اس کے بعد میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں بھارتی فوجی میرے ہاتھوں واصل جہنم ہوئے تھے۔ فوج نے سڑک پر پھیلے ہوئے خون کو پیٹرول چھڑک کر آگ لگا کر اوپر مٹی بکھیر دی تھی۔ تاہم سڑک کے کناروں پر پر خون کے دھبے ابھی نظر آ رہے تھے۔

رات کے وقت آکاش وانی نے اس واقعے کو ایسے انداز میں پیش کیا، گویا فوج نے کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو۔ دو غیر ملکی ”اگر وادیوں“ کے مارے جانے کا تو ریڈیو نے پر زور پروپیگنڈہ کیا، لیکن اپنے سورماؤں کے عبرت انجام کو گول کر گئے۔ اس کے علاوہ ایک پیکا گن اور گرینیڈ تھرور پکڑنے کی خبر بھی نشر کی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فوجی حکام اسلحہ کے اس قدر ”ماہر“ تھے کہ سنائپنگ گن کو ”پیکا“ قرار دے رہے تھے۔ پیکا کے ساتھ ہی یہ خبر پھیل گئی کہ شاہین بھائی بھی شہید ہو گیا ہے۔ بعد میں جہاں بھی شناسا ملتے تو ان کی وارفتگی اور حیرانی دیدنی ہوتی۔ ایسے جیسے کسی نے کفن میں لپٹے ہوئے فوراً آنکھیں کھول دی ہیں۔

اگلے دن پولیس نے تینوں شہدائے لاشیں مقامی افراد کے حوالے کر دیں۔

اس موقع پر چھندن اور سلورہ کے باشندوں کے درمیان شہدا کی لاشوں کے حصول پر آپس میں کافی ”سردی گرمی“ بھی ہوئی۔ دونوں گاؤں کے افراد چاہتے تھے کہ شہداء کی تدفین کا اعزاز ان کے گاؤں کو حاصل ہو۔ تاہم سلورہ والے بازی لے گئے اور تینوں شہیدوں کے جسد خاکی سلورہ کے قبرستان میں نذیر احمد کھوسہ شہید کے پہلو میں سپرد خاک کر دیے گئے۔ اس قبرستان میں چند مقامی شہداء بھی آرام کر رہے ہیں۔ قبرستان ایک فوجی کیمپ کے سائے میں ہے، میری بڑی خواہش تھی کہ اپنے ساتھیوں کے جنازے میں شریک ہوں۔۔۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے ان کی تدفین کروں۔۔۔۔۔ ان کی خون آلود پیشانیوں پر بو سے دوں، مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ فوج نے علاقے کو پوری طرح گھیر رکھا تھا۔ گاندر بل کے علاقے میں ہزاروں کی تعداد میں تازہ دم فوج پہنچ گئی تھی۔ شرار و رستیوں کے گلی کوچے فوجیوں سے اٹ چکے تھے۔ ڈسٹرکٹ کمانڈر شاہد الاسلام نے فوری طور پر مقامی نظم کو ہدایت کی کہ فوج شاہین بھائی کی تلاش میں سرگرداں ہے اور انہیں یہاں خطرہ ہے، اس لیے فوراً کنگن پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔

نئے مہمان

اگلے روز نماز عصر ادا کرنے کے بعد چند مقامی ساتھی میرے پاس آ پہنچے۔ انہوں نے کہا تیار ہو جائیں، آپ کے سفر کا انتظام مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے پیکا اور پٹھو سنبھالا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ سڑک کے کنارے ایک محفوظ مقام پر دو ٹرک ہمارے انتظار میں تھے۔ ایک ٹرک میں عام شہریوں کے ہمراہ چند مجاہدوں کو سوار کیا گیا، جن کے پاس وائرلیس سیٹ تھا۔ ان کو آگے روانہ کیا اور ایک کلو میٹر کا فاصلہ رکھ کر ہم دوسرے ٹرک میں روانہ ہوئے۔ وارسو، کربامہ، لارسن اور ڈانگر پورہ سے ہوتے ہوئے ہم لار کے قریب پہنچے، جہاں سڑک کے ساتھ ایک فوجی کیمپ تھا۔ کیمپ کے قریب سے گزرنے والی گاڑیوں کو فوجی چیک کر رہے تھے۔ ساتھیوں کے مشورے سے میں ٹرک سے اتر گیا اور پیدل ہی منی گام روانہ ہو گیا اور دونوں ٹرک وہیں سے واپس بھیج دیے گئے۔

مغرب کی اذان کی روح پرور آواز فضا میں گونج رہی تھی، میں ایک چھوٹی سی بستی کے باہر ایک پگڈنڈی پر اکیلا ہی جا رہا تھا۔ موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ ایک چھوٹے سے نالے کے کنارے میں نے اپنے ہتھیار اتارے، پٹھو زمین پر رکھا اور

وضو کر کے نماز مغرب ادا کی۔ نماز کے بعد میں نے دوبارہ اپنا سفر شروع کیا تو چاند منی گام کے پہاڑوں کے عقب سے نکل کر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مجھے پیاس نے بے چین کیا تو راستے سے ہٹ کر ایک کچے مکان کے دروازے پر پہنچا۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے مجھے دیکھا تو بھاگتا ہوا میرے پاس آگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں مجاہد ہوں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں تو اس کے گلاب سے چہرے پر مسرت کے کئی رنگ بکھر گئے۔ میں نے پانی مانگا تو وہ دوڑتا ہوا اندر گیا اور چند لمحے بعد اپنے باپ کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا۔ اس کے باپ نے بڑی گرم جوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر ایک گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا گلاس پانی کی بجائے دودھ سے لبالب تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا، میں نے تو پانی مانگا تھا۔ اس نے کہا۔۔۔۔۔ ”آپ مجاہد ہیں اور پاکستان سے آئے ہوئے عزیز ترین مہمان ہیں۔ آپ پانی مانگیں گے تو ہم دودھ پیش کریں گے۔“ میرے پاس ان کی محبت کا کوئی بدلہ نہیں تھا۔ میں نے دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا، وہ دونوں محبت و عقیدت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

گھنٹوں کے پر صعوبت سفر کے بعد میں رات کے بارہ بجے منی گام میں عقابوں کے ایک نشیمن پر پہنچا۔ وہاں چند مجاہد میرے انتظار میں تھے۔ میں نے سیٹ کے ذریعے انہیں اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی کر دی تھی۔ کھانا کھا کر نماز عشاء ادا کر کے گھاس کے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ علی الصبح نماز اور ناشتے کے بعد پھر رخصت سفر باندھا، ساتھیوں سے اجازت لی اور کنگن کی طرف روانہ ہو گیا۔ منی گام سے کنگن کا سفر میں نے پہاڑ پر ایک سیدھی پگڈنڈی پر کیا۔ راستے میں چرواہے اور مقامی باشندے بڑی عقیدت اور محبت سے ملتے۔ میں ان

سے سلام دعا کرتا، ان کی دعائیں لیتا اور فتح کا نشان بناتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔
 دوپہر کے وقت بخون پہنچا۔ بخون میں معلوم ہوا کہ عبدالرحمان بھائی اور صابر
 بھائی دس پاکستانی مجاہدین کے ہمراہ ایک مرتبہ پھر کنگن کے پہاڑوں میں پہنچ چکے ہیں
 اور ٹنگ چھتر میں مقیم ہیں۔ مجھے ان کی آمد کی اطلاع ملی تو میرے قدموں میں مزید
 تیزی آگئی۔ میں اگلے روز کنگن میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ شیروں کی کچھار میں نئے
 شیر ملے۔ دیر کے عطا الرحمان، اوکاڑہ کے طاہر سلیم، ملتان کے ابن سیفل،
 افغانستان کے ابوذر، خوشاب کے عبدالحسب، میرپور کے مصعب اور عمران، منگ
 آزاد کشمیر کے ذوالفقار احمد اور زمر گل اور پلندری آزاد کشمیر کے سلیم اکبر سے
 ملاقات ہوئی۔ ان سے مل کر ناقابل بیان خوشی ہوئی۔ کافی دیر تک ہم ایک دوسرے
 کو اپنی پیتا سنا تے رہے۔ ابھی تک انہوں نے کھانے پینے کا اپنا بندوبست نہیں کیا تھا
 اور گاؤں سے کھانا منگوا رہے تھے۔ میں نے فوری طور پر چولہے تیار کیے اور برتن
 منگوا کر اپنا کچن چالو کر لیا۔ کھانے پینے کا بندوبست کرنے کے بعد ہم نے اصل کام
 کی طرف توجہ کی۔ کنگن میں گزشتہ چند ماہ کے قیام کی وجہ سے میں اس علاقے کے
 چپے چپے سے واقف ہو گیا تھا۔ ناشتے کے بعد نئے ساتھیوں کو لے کر نیچے گاؤں میں
 چلا جاتا اور ضرورت کی اشیاء خرید کر لے آتا تھا۔ اس دوران میں نے نئے
 ساتھیوں کو پہاڑوں، آبادیوں، جنگلوں اور ان کے بھول، بھلیوں جیسے راستوں سے
 مکمل طور پر متعارف کر دیا۔

دس دن بعد ایک روز ہم سب ساتھی ناشتے کیے بغیر اپنی کمین گاہ سے نکلے۔
 فیصلہ یہ ہوا تھا کہ ناشتا نیچے گاؤں میں جا کر کریں گے۔ گاؤں سے ایک فرلانگ کے
 فاصلے پر جنگل کی ٹکڑ پر میں نے ساتھیوں کو انتظار کرنے کو کہا اور خود مصعب بھائی کو
 ساتھ لے کر ناشتا لینے چلا گیا۔ ابھی ہم گاؤں کے پہلے گھر سے چند میٹر دور ہی تھے کہ

دو افراد بھاگتے ہوئے ہمارے طرف آتے دکھائی دیے۔ قریب آئے تو ایک نے ہانپتے کانپتے کہا۔۔۔۔۔ ”فوج آ رہی ہے۔“ یہ سن کر ہم واپس اپنے ساتھیوں کی طرف چل پڑے۔ کوئی سو میٹر کے فاصلے پر سامنے اپنے تین ساتھی دکھائی دیے۔ میں نے ازراہ مذاق اونچی آواز میں انہیں ”ہینڈز اپ“ کہا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ ساتھی چوکنے ہو جائیں، تاکہ میں انہیں فوج کی آمد کے بارے میں بتا سکوں۔ اسی لمحے میری نظر دائیں طرف جانے والی چھوٹی سی پگڈنڈی پر پڑی، تو کیا دیکھتا ہوں مجھ سے محض بیس میٹر کے فاصلے پر تین فوجی ہاتھ اٹھائے کھڑے ہیں۔ ٹوپوں پر انہوں نے دھان کے پودے اور وردی پر مکئی کے پتے وغیرہ لگا کر خود کو کیمو فلاج کیا ہوا تھا۔ میں فوراً ساری صورت حال سمجھ گیا۔ اس وقت میرے پاس کلاشن کوف تھی۔ مصعب بھائی کو سرگوشی میں فوراً پوزیشن لینے کو کہہ کر خود درخت کے ایک موٹے تنے کی آڑ لے کر سب سے آگے کھڑے فوجی پر کلاشن کوف سے فائر کر دیا۔ فوجی چند فٹ فضا میں اچھلا اور پھر گر پڑا۔ فائر کے ساتھ ہی دوسرے فوجی نیچے کی طرف لڑھک گئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اونچی آواز میں احکامات جاری کرنے شروع کر دیے:

”شاہین پلاٹون دائیں طرف سے دو سو میٹر کے فاصلے سے گھیرا ڈالے۔۔۔۔۔ پیکا گروپ بائیں طرف سے آگے بڑھے۔۔۔۔۔ کوئی فوجی بھاگنے یا بچ کر جانے نہ پائے۔۔۔۔۔ دوسرے پچاس ساتھی سامنے سے فائرنگ کریں۔۔۔۔۔ دیکھیں۔۔۔۔۔ میزائلوں اور راکٹ لانچروں سے اس وقت تک حملہ نہیں کرنا جب تک میں حکم نہ دوں۔“ ساتھی میرے ان احکامات کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔ انہوں نے فوراً پوزیشنیں لے لیں۔ اکثر ساتھی نئے تھے اور ان کا یہ پہلا تجربہ بھی تھا، تاہم انہوں نے ہمت و جرات سے صورت حال سمجھ لی۔ خوش قسمتی سے ہم گھنے جنگل کے

دامن میں تھے۔ ضرورت کے وقت جنگل ہمیں آغوشِ مادر کی طرح پناہ دینے کے لیے ہمہ تن تیار تھا۔

گولوں اور گولیوں کی آوازوں سے سارا علاقہ گونج رہا تھا۔ ایک ہزار کے قریب فوجیوں نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اگر بزدل نہ ہوتے تو ہمارا ان کی گرفت سے نکلنا ممکن نہ ہوتا۔ پگڈنڈی سے آنے والے فوجی کو جب میں نے نشانہ بنایا تو اس کے پیچھے آنے والے پچاس فوجیوں نے وہیں پر پوزیشنیں لے کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہم پندرہ منٹ تک ان کی فائرنگ سے ”لطف“ اٹھاتے رہے۔ ہم نے فائرنگ سے احتراز کیا، کیونکہ فوجی ہمیں نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے بعد میں نے مصعب بھائی کو جنگل کی طرف نکلنے کے لیے کہا۔ ایک تنگ سے کچے راستے کے ساتھ بنی ہوئی چھوٹی سی دیوار کی آڑ لے کر ہم نے آہستہ آہستہ جنگل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ہم جنگل میں پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اللہ کا شکر تھا کہ سب ساتھی خیریت سے تھے۔ چند منٹ بعد ہم دوبارہ پہاڑ پر اپنی کمین گاہ کی طرف چل پڑے۔ راستے میں عبدالرحمان بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ ”شاہین بھائی آج آپ نے پر تکلف ناشتا کرایا۔۔۔ کیا بھوکے پیٹ ہم سے فوجیوں پر حملہ کرانا ضروری تھا۔ کم از کم پہلے کچھ کھلاتے پھر لڑاتے۔“ ان کی بات سن کر سب ہنس پڑے۔ اپنی کمین گاہ پر پہنچ کر میں نے سب ساتھیوں کے لیے ناشتا تیار کیا اور عبدالرحمان بھائی کی شکایت دور کی۔

ہم فوجیوں کے حصار سے نکل آئے تھے، لیکن وہ ابھی تک ہمارے ”مقابلے“ پر ڈٹے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی اس جھڑپ میں صرف ایک فوجی ہی ہلاک ہوا تھا، لیکن یہ فوج کے لیے بدنامی کا دھبہ بن گیا۔ لوگوں کو اس ذلت سے لاعلم رکھنے کے

لیے انہوں نے مرے ہوئے فوجی کو قریب ہی مکئی کے کھیت میں چھپا دیا اور دن بھر فارنگ کرتے رہے۔ گاؤں کے لوگوں کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی۔ مغرب کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ مقابلے پر کوئی نہیں تو انہوں نے لاش کو اٹھایا اور مکئی کے کھیتوں سے ہوتے ہوئے نالہ سندھ کے پل پر پہنچے۔ انہیں پل عبور کر کے سامنے اپنے علاقے کے ایک فوجی کیمپ میں پہنچنا تھا۔ پل پر سے گزرتے ہوئے گاؤں کے چند لڑکوں نے لاش کو دیکھ لیا۔ فوجی جس خبر کو چھپانے کے لیے مختلف حربے استعمال کر رہے تھے وہ خبر پوری رسوائی کے ساتھ عام ہوئی۔ چند دن تک لوگ مزے لے لے کر اسے ایک دوسرے کو سناتے رہے۔

نئے ساتھی اپنے ہمراہ کافی ایمونیشن لائے تھے۔ ایک پیکا گن اور دو گرینیڈ تھرور بھی ہمارے سامان حرب و ضرب کا حصہ بن گئے۔ ہماری ضرورت کسی حد تک پوری ہو چکی تھی۔ ہم نے فارغ اوقات میں نئی کمین گاہ کے قیام کی طرف توجہ دی اور چند دنوں میں ایک نیا ”گھر“ بنا لیا۔ اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اگلے دن دس پاکستانی مجاہدین کا ایک نیا گروپ کنگن میں ہم سے آ ملا۔ اس گروپ میں گو جر خان کے عادل شہباز، اوکاڑہ کے ذکی گوریلا اور عمر انقلابی، پاک پتن کے سیف اللہ اور میرپور کے شہباز وغیرہ تھے۔ نئے ساتھیوں کی آمد سے ہمارے ”گھر“ میں عید کا سماں ہو گیا۔ سب ساتھی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے، کوئی پاکستان کے موسم کا پوچھ رہا ہے، تو کوئی وطن کے تازہ حالات جاننے کے لیے بے چین ہے، کوئی افغانستان کی سیاسی اور عسکری تبدیلیوں سے باخبر ہونا چاہتا ہے، تو دوسرا ایران وطن کی خیریت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہے۔ غرض رات گئے تک یہ محفل پورے شباب پر رہی۔ یہ اگست ۱۹۹۳ء کے پہلے ہفتے کی ایک رات تھی۔

کنگن واپسی کے بعد علاقے کے لوگ مجھے بڑی حیرانی سے دیکھتے اور ملتے تھے۔
انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ گاندربل کی کارروائی کے بعد میری
شہادت کی خبر پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ اب مجھے دوبارہ دیکھ کر ان کے
چہروں پر خوشی کی لہریں دوڑ جاتی تھیں۔

لداخ ہائی وے کا معرکہ

نئے ساتھیوں کی آمد کی وجہ سے اب ہماری تعداد بیس ہو گئی تھی۔ میرا دل نئے ساتھیوں سے مل کر دشمن پر حملے کے لیے بے چین ہو گیا۔ چنانچہ اگلے دن ہی ہم نے فوج پر حملے کی سوچ بچار شروع کر دی۔ چند دن قبل ڈسٹرکٹ کمانڈر شاہد الاسلام نے وائرلیس سیٹ پر مجھے پیغام دیا تھا کہ حزب المجاہدین نے امرنا تھ یا ترا ہر قیمت پر روکنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے اپنے علاقے میں آپ نے اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنانا ہے۔ میں نے ساتھیوں کو اس فیصلے سے آگاہ کیا اور تنظیم کے اس فیصلے پر عملدرآمد پر بھی غور کیا گیا۔ نئے ساتھی کنگن کے علاقے سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے مجھ پر ہی یہ ذمہ داری ڈال دی کہ میں فوج پر حملے کا پروگرام ترتیب دوں۔ میں نے ایک ایکشن پلان تیار کر کے ان کے سامنے رکھا۔ سب نے اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ اس کے بعد میں ساتھیوں کو لے کر قریبی گاؤں کی طرف چل دیا۔

دن کے تیسرے پہر گاؤں کے عقب میں واقع جنگل میں ایک بلند مقام پر کچھ دیر ہم سستانے کے لیے رکے۔ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد نیچے اتر کر نالہ سندھ

کو عبور کیا اور سامنے فوج کے علاقے میں داخل ہو گئے۔ فوجی کیمپوں سے بچتے بچاتے ہم سری نگر لداخ ہائی وے کو عبور کر کے پہاڑ کے دامن میں پہنچے۔ نالے کے کنارے اخروٹ کے ایک بڑے درخت کے نیچے رک کر میں نے تین تین مجاہدین پر مشتمل پانچ گروپ بنائے۔ ہر گروپ میں دو مقامی اپر گراؤنڈ مجاہدین کو بھی شامل کیا۔ ان گروپوں کو میں نے سڑک سے دو سو میٹر کے فاصلے پر مختلف مقامات دکھا دیے، جہاں جہاں پوزیشنیں لینی تھیں۔ ہر گروپ کے درمیان تقریباً آٹھ سو میٹر کا فاصلہ رکھا گیا۔ سب ساتھیوں کو اچھی طرح سمجھا اور بتا دیا کہ حملہ کس طرح، کہاں سے اور کب کرنا ہے۔ اس طرح یہ ساتھی گروپوں کی شکل میں سری نگر لداخ ہائی وے کے ساتھ ساتھ پانچ کلومیٹر کے علاقے میں پھیلا دیے گئے۔ مقامی غیر مسلح مجاہدوں نے فوج پر نظر رکھنی تھی اور خطرے کی صورت میں سیٹی بجا کر مجاہدین کو آگاہ کرنا تھا۔ ہمارے پاس صرف دو وائرلیس سیٹ تھے، جب کہ گروپ زیادہ تھے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ہم نے قدیم اشاراتی طریقہ اختیار کیا۔ مختلف پوزیشنوں پر جاتے اور نکلتے وقت ہر ساتھی نے مخصوص جگہوں پر ایک ایک پتھر رکھنا تھا، تاکہ وہاں سے گزرنے والے ساتھیوں کو علم ہو جائے کہ کتنے ساتھی جا چکے ہیں۔

میں سب سے آخری گروپ کے ساتھ تھا۔ میرے ہمراہ عمران اور راشد تھے۔ ہم نے ہائی وے سے دو سو میٹر دور مکئی کے کھیتوں میں پوزیشنیں لینی تھیں۔ منصوبے کے مطابق اگلے دن سہ پہر ساڑھے تین بجے ہر مجاہد نے اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ جانا تھا۔ اب ہمارے گروپ کے پاس پانچ پیکا گنیں، تین سنائپنگ گنیں اور پانچ گرینیڈ تھرو تھے۔ اس کے علاوہ ایمونیشن بھی کافی تھا۔ ایک مرتبہ ساری کارروائی کی ریسرسل کرنے کے بعد ہم ایک نزدیکی گاؤں میں پہنچے۔ کھانا وغیرہ کھایا

اور پھر ایک محفوظ پناہ گاہ پر شب ب سری کے لیے چلے گئے۔ اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کر ہم طے شدہ مقامات کی طرف چل پڑے۔

پروگرام کے مطابق ہم نے بھارتی فوج کے اس قافلے پر حملہ کرنا تھا جو ہفتے میں چار یا پانچ بار لداخ سے سری نگر جایا کرتا تھا۔ اس فوجی قافلے میں کم و بیش دو سو چھوٹی بڑی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اس قافلے پر ہم ایک مرتبہ پہلے بھی کامیاب حملہ کر چکے تھے۔ اس حملے کی وجہ سے اب ہائی وے کے دونوں اطراف میں دور دور تک بھارتی فوجی تعینات کر دیے گئے تھے۔ جس روز قافلے نے گزرنا ہوتا، فوجی صبح ہی آ کر پہرے پر بیٹھ جاتے۔ ہم نے ان ہی فوجیوں سے چند میٹر دور بڑی احتیاط سے پوزیشن لینی تھی تاکہ ان کی ہم پر نظر نہ پڑے۔ وقت مقررہ پر سب نے کمال رازداری سے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ قافلے نے چار بجے کے قریب گزرنا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ اس حملے کا آغاز میں نے کرنا ہے۔

چار بجے کے قریب فوجی گاڑیوں کا قافلہ دور سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے پیکا گن پر پوزیشن پہلے ہی لی ہوئی تھی اور ٹرائیگر پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔ شروع کی پچاس ساٹھ گاڑیوں کو میں نے گزرنے دیا۔ ان میں جیپس، ون ٹن اور شکتی مان تھیں۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ گاڑیاں میرے دوسرے ساتھیوں کی رینج میں پہنچ چکی ہیں تو پھر میں نے پیکا سے ایک VIP بس کا نشانہ لے کر برسٹ مارا۔ پھر کیا تھا، سارا علاقہ گولوں اور گولیوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ دھماکے اتنے شدید تھے کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہونے لگے۔ ایک خون ریز جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس طرح کی جنگی فضا میں نے اپنی جہادی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، حتیٰ کہ افغانستان کے زبردست معرکوں میں بھی ایسی زوردار لڑائی میرے مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔ پانچ پیکا، پانچ گرینیڈ تھرو اور تین سناپنگ گنیں دشمن پر موت کے

شعلے اگل رہی تھیں، اور وہ اس میں بھسم ہو رہے تھے۔ دوسری طرف ہائی وے کی حفاظتی فوج نے بھی بھاری ہتھیاروں سے فائرنگ شروع کر دی تھی، لیکن وہ نشانہ کس کو بناتے، ہم تو ان کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ فوجی حسب معمول ہوا اور جنگل کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اس اچانک حملے نے گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو بری طرح حواس باختہ کر دیا۔ بن باغ کے مقام پر ایک ٹرک بس سے ٹکرایا اور پھر دونوں ندی میں جا گرے۔ میرے سامنے ایک بس موڑ کاٹتے ہوئے بے قابو ہوئی اور سڑک کے کنارے دکانوں کو تھس تھس کرتی ہوئی دریا برد ہو گئی۔

میں دس منٹ تک چن چن کر گاڑیوں پر برسٹ مارتا رہا۔ اس کے بعد میں نے فائرنگ روک دی۔ میرے پاس وائرلیس سیٹ تھا، جبکہ ایک سیٹ ذکی گوریلے کے پاس تھا۔ میں نے سیٹ کے ذریعے ان سے صورت حال پوچھی تو بولے۔۔۔ ”مجھے تو بڑا مزہ آ رہا ہے اس لیے ابھی میں فائرنگ جاری رکھوں گا۔“ میں انہیں جلد از جلد نکلنے کا کہہ کر واپسی کی تدبیر کرنے لگا، تاہم وہ ایک گھنٹے تک دل کے ارمان نکالتے رہے۔ سورج کنگن کے پہاڑوں سے رخصت ہو رہا تھا جب میں ساتھیوں کے ہمراہ اٹھا اور پہلے سے تجویز کردہ راستے سے نکلنے لگا۔ حسب وعدہ ہم راستے میں پتھروں کے ذریعے ساتھیوں کی خیریت سے بھی آگاہی حاصل کرتے جا رہے تھے۔

عادل شہباز اور ذکی گوریلا وہاں سے نکل کر بجائے ہمارا انتظار کرنے کے تنگ چھتر میں اپنی کمین گاہ میں پہنچ گئے۔ عبدالرحمان بھائی اور کمانڈر بلال پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ علالت کی وجہ سے یہ دونوں اس معرکے میں شریک نہیں ہو سکے۔ تاہم انہیں دھماکوں کی گھن گرج سے معرکے کی شدت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ان چاروں نے اس پناہ گاہ کو غیر محفوظ تصور کر کے منی گام کی راہ لی۔ چاروں پہاڑ پر ہی رات کو سفر کرتے رہے، ایک محفوظ جگہ سے انہوں نے نالہ سندھ اور سری نگر

لداخ ہائی وے کو عبور کیا۔ دن کو وہ کسی محفوظ مقام پر آرام کرتے اور رات کو سفر کرتے۔ دو راتوں کے سفر کے بعد وہ خیریت سے منی گام پہنچ گئے۔

میں دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مغرب کے بعد جنگل میں ہی ایک محفوظ مقام پر چلا گیا۔ میں دن کے وقت ہی گاؤں کے چند گھروں میں کھانا تیار کرنے کا کہہ گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد کھانے سے فارغ ہوئے، پھر گاؤں سے بستر منگوائے اور انہیں لے کر جنگل میں اوپر چڑھنے لگے۔ ایک جگہ ہمیں ایک ٹھارا (چرواہوں کا گھر) مل گیا جو خالی پڑا تھا، ہم نے اس کی جھاڑ پونچھ کی اور بستر بچھا کر سو گئے۔

اس حملے میں فوج کی نو گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہوئیں جن میں سے چند ایک سندھ ندی میں جاگری تھیں۔ متعدد آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ بہت سی گاڑیاں اور ان میں سوار فوجی ہماری گولیوں کا نشانہ بنے۔ مقامی اخبارات نے ایک درجن گاڑیوں کی تباہی اور سینکڑوں فوجیوں کی ہلاکت اور زخمی ہونے کی خبر شائع کی۔ ہماری اپنی اطلاع کے مطابق نو گاڑیوں کی تباہی کے علاوہ ایک سو سے زیادہ فوجی مارے گئے اور پچاس کے لگ بھگ شدید زخمی ہوئے تھے۔ یہ بھارتی فوج کا ایسا زبردست نقصان تھا جس کا اثر مدتوں موجود رہا۔ اگلے دو روز تک اس علاقے میں زبردست افراتفری پھیلی رہی۔ ان فوجی افسروں کی لاشوں کی تلاش کا کام سرگرمی سے ہو رہا تھا جو گاڑیوں سمیت نالے کے گہرے پانی کی نذر ہو گئے تھے۔ علاقے کے سارے گاؤں فوج نے گھیر رکھے تھے۔ کسی فرد کو ان بستیوں میں آنے یا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ کرینوں کے ذریعے فوجی گاڑیوں کو ندی سے نکالا گیا۔ تباہ ہونے والی دوسری گاڑیوں کو بھی کرینوں کے ذریعے سڑک سے فوجی کیمپوں میں منتقل کیا گیا۔ زخمیوں کو فوجی ہسپتالوں میں بھیجا جا رہا تھا جب کہ مرے ہوئے فوجیوں کی لاشیں بھی اکٹھی کر کے ٹرکوں کے ذریعے سری نگر بھیجوائی جا رہی تھیں۔

تین دن تک فوج کا یہ آپریشن جاری رہا۔

اگلا دن ہم نے جنگل کے دامن میں ہی گزارا اور دو رہین سے بھارتی فوج کی رسوائی کا تماشا دیکھتے رہے۔ مغرب کے وقت شب ب سری کے لیے دوبارہ جنگل میں اوپر جا رہے تھے کہ راستے میں چند چرواہوں سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ہماری درخواست پر شب ب سری کے لیے ہمیں بستر فراہم کر دیے۔ بستر لے کر ہم ایک ٹھارے پر پہنچے جو ان دنوں بالکل خالی پڑا تھا۔ رات گزارنے کے بعد علی الصبح ہم نیچے اترے تاکہ بستر چرواہوں کو واپس لوٹا سکیں۔ نیچے ایک جگہ ہمیں بھیڑ بکریاں چرتی نظر آئیں، ہم ادھر مڑ گئے۔ اچانک کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے اونگھتے ہوئے فوجیوں پر میری نظر پڑی۔ ہم وہیں رک گئے۔ بستر آہستگی سے وہیں چھوڑ کر میں نے ساتھیوں کو ساتھ لیا اور دائیں طرف ایک پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے دوبارہ جنگل میں چلا گیا۔ دراصل رات فوج اس جنگل میں پہنچ گئی تھی جس کا ہمیں علم نہیں ہو سکا تھا۔ اب جنگل کے دامن میں واقع بستیوں میں ہر سمت فوج ہی فوج تھی۔ لہذا گاؤں میں ہمارا داخلہ اب ممکن نہیں رہا تھا۔ دوسری طرف چند میل کے فاصلے سے پہاڑ کی چوٹی پر بھی فوج پہنچ چکی تھی۔ اس طرح اب ہم چاروں طرف سے فوج کے محاصرے میں تھے۔ ہماری نقل و حرکت محدود ہو کر رہ گئی۔ کھانے پینے کی اشیاء ہمارے پاس موجود نہ تھیں اور ہم پہاڑ پر پانچ سے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی تک نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ فوج نے ان راستوں پر بھی پہرہ بٹھادیا تھا جن سے ہو کر ہم تنگ چھتر کی اپنی مرکزی کمین گاہ پر پہنچتے تھے۔ ان راستوں کے علاوہ باقی پہاڑ ایسی خطرناک چٹانوں پر محیط تھا جن پر چلنا ممکن نہیں تھا۔ فوج نے بھی اس خطرناک علاقے میں آنے کی کوشش نہیں کی۔

تین دن تک ہم جنگلی گھاس کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے رہے اور بھوکے

پیا سے اس مختصر سے علاقے میں قیدیوں کی طرح بیٹھے سوچتے رہے کہ محاصرہ کس طرح توڑیں۔ کوئی راہ نہ پا کر بالا خر میں نے ساتھیوں سے کہا کہ ہم کب تک یوں ہی اس پنجرے میں پھڑپھڑاتے رہیں گے، آزادی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ انہوں نے بھی میرے خیالات سے اتفاق تو کیا، لیکن آزادی کی راہ تلاش کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی۔ میں نے کہا میری کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں، آج میں محاصرہ توڑنے کی کوشش کروں گا۔

نماز مغرب میں ساتھیوں کے ہمراہ ادا کرنے کے بعد جنگل میں بہنے والے ایک نالے کے ساتھ ساتھ نیچے گاؤں کی طرف چل دیا۔ میں کمانڈو وردی میں ملبوس تھا اور حسب معمول پیکا میرے کندھے پر تھی۔ دشمن چپے چپے پر موجود تھا اس لیے میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ گاؤں سے چند سو میٹر دور ہی تھا کہ راستے میں ایک جگہ چند فوجی بیٹھے نظر آ گئے۔ میں راستہ بدل کر ان کے پیچھے سے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں کے پیرو جوان مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔۔۔۔۔ ”فوراً واپس جاؤ“ ہر طرف فوج ہی فوج ہے۔“ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”چلا جاؤں گا لیکن پہلے آپ کھانے کا بندوبست کریں۔“ ایک ہمدرد نے گھر کے ارد گرد پہرے کا بندوبست کر کے مجھے گھر میں بٹھا دیا۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔ ”زیادہ سے زیادہ کھانا تیار کر کے مجھے فوری طور پر دے دیں کیونکہ بہت سے مجاہدین جنگل میں بھوکے بیٹھے ہیں۔“ انہوں نے ہمسائیوں کے گھروں سے کھانا اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ جس گھر میں جو پکا تھا یا پک رہا تھا وہ اٹھالائے اور ایک دیگ میں ڈال دیا۔ جب دیگ بھر گئی تو میں نے اسے ایک کمبل میں لپیٹ کر پیٹھ پر لادا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک دفعہ پھر نالے سے گزر کر میں خیریت سے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ ساتھیوں نے مجھے دیکھا

توان کی جان میں جان آئی۔ دیگ سے مختلف کھانوں کا مرکب نکال کر سب نے سیر ہو کر کھایا۔ اگلے تین دن تک ہم نے اسی کھانے پر گزارا کیا۔

فوج نے پہاڑ کی دوسری طرف ناگ بل، چھترہامہ، دارا اور یوشامہ کے گاؤں کا بھی وسیع پیمانے پر کریک ڈاؤن کر رکھا تھا، تاکہ ہم پہاڑ سے اتر کر سری نگر کی طرف نہ جاسکیں۔ بادامی باغ سری نگر کے علاوہ کنگن کے ریئر ہیڈ کوارٹر اور دوسرے تمام کیمپوں کی فوج بھی اس سرچ آپریشن میں شریک تھی۔ ایک طرف تباہ حال گاڑیوں اور لاشوں کو سمیٹنے کا کام جاری تھا، جب کہ دوسری طرف فوج وسیع پیمانے پر ہماری تلاش کا کام بھی کر رہی تھی۔ چھ دن بعد فوج ہماری تلاش سے مایوس ہو گئی اور پڑاؤ اٹھا کر اپنے اپنے کیمپوں کو سدھار گئی۔ اس دوران ہم جنگل میں مقیم رہے اور فوج کی نقل و حرکت کا باریک بینی سے جائزہ لیتے رہے۔ فوج کے جاتے ہی ہم نیچے گاؤں میں اتر آئے۔ لوگوں نے ہمیں دیکھا تو ہر طرف خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ہمیں فوج کی تباہی کے قصے مزے لے لے کر سناتے رہے۔ فوج نے بن باغ کے قریب تین عام شہریوں کو بھی شہید کر دیا تھا۔ ایک شخص فوجی گاڑی بے قابو ہونے کی وجہ سے دکان میں کچلا گیا تھا۔ فوج نے سارے گاؤں کی آبادی کو تین دن تک گھروں میں محبوس رکھا اور مختلف گھروں سے کھانا بھی جبری کھاتے رہے۔ تاہم مشکلات اور مصائب کے باوجود مقامی لوگ ہماری کامیاب کارروائی پر پھولے نہیں سمارہے تھے۔

لوگوں سے ملنے اور ان کی خیریت دریافت کرنے کے بعد ہم ٹنگ چھتر میں اپنی مرکزی کمین گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ ہمارے پیچھے فوج ہماری اس کمین گاہ تک پہنچ گئی تھی اور اس نے ہمارا سامان تھس تھس کر دیا ہے۔ ہم نے از سر نو اس جگہ کو رہائش کے قابل بنایا، چولہے وغیرہ تیار کیے اور کچن کو

دوبارہ شروع کیا۔ دو ہفتے تک ہم نے اپنی اس رہائش گاہ میں آرام کیا۔ منی گام جانے والے ساتھیوں سے رابطہ کر کے ان کی خیریت دریافت کی اور انہیں واپسی کی دعوت دی۔

بدترین نقصان اٹھانے کے بعد کنگن کے علاقے میں فوج کی پکٹیں خود رو پودوں کی طرح ہر طرف اگ آئی تھیں۔ فوج کے ان اقدامات سے ہم غافل تو نہیں تھے، لیکن انہیں اپنے لیے کوئی بڑا خطرہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ہماری پناہ گاہ سے ایک ہزار میٹر کے فاصلے پر بھی ایک فوجی پکٹ قائم ہو چکی تھی۔ وہاں فوجی صبح آتے اور چار بجے شام چلے جاتے تھے۔ دن بھر ہم ان سے کچھ دور بیٹھے گپیں لگاتے رہتے۔ فوجی ہمیں دیکھتے لیکن پہلو بچا جاتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی فوج پٹائی کرتی تو فوجیوں کو چڑانے کے لیے لوگ انگلی سے ہمارے ٹھکانے کی طرف اشارہ کر کے کہتے..... ”وہ ہیں آپ کے دشمن، انہیں جا کر مارو۔“ یہ سن کر فوجی خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے۔

موت کے منہ میں

دو ہفتے بعد میں نے اپنے ضلعی کماندان شاہد الاسلام کو وائرلیس سیٹ پر اپنے مسائل بتائے۔ وہ کنگن کے عقب میں سری نگر کی جانب ناگ بل کے علاقے میں مقیم تھے۔ انہوں نے مجھے بالمشافہ بات کرنے کی دعوت دی۔ میری بھی خواہش تھی کہ مل بیٹھ کر مسائل حل کیے جائیں۔ میں نے منی گام جانے والے ساتھیوں کو وائرلیس سیٹ کے ذریعے بتایا کہ ہم سری نگر جا رہے ہیں اس لیے آپ ہم سے جلد آلیں۔ پندرہ دن بعد ہم تنگ چھتر کی کمین گاہ سے نکلے اور مختلف بستیوں میں سے سفر کرتے ہوئے گٹل باغ پہنچے۔ گٹل باغ میں عبدالرحمان بھائی، کمانڈر بلال، عادل شہباز اور ذکی گوریلا بھی دوبارہ ہمارے گروپ میں شامل ہو گئے۔ اس طرح ہمارا گروپ چالیس افراد پر مشتمل ہو گیا۔ نصف کے قریب کشمیری مجاہدین بھی ہمارے گروپ کا حصہ تھے۔ مختلف آبادیوں اور بستیوں سے ہوتے ہوئے تین دن بعد ہم سری نگر کے مضافات میں ناگ بل کی بستی میں پہنچے۔ سفر کے دوران ہی ۱۴ اگست کا تاریخی دن بھی تھا۔ اس روز ہم نے باقاعدہ جشن آزادی پاکستان منایا۔ پاکستان کے حق میں فلک شگاف نعرے لگائے اور مادر وطن کی سلامتی اور استحکام کے لیے

دعائیں مانگیں۔ اس روز وطن سے دور رہ کر وطن کی محبت کے اصل ذائقے کو چکھنے موقعہ بھی ملا۔ ناگ بل کے مشہور باغات میں کمانڈر شاہد الاسلام سے بات چیت ہوئی۔ حفاظتی دستے سمیت پیچیس کے قریب مقامی مجاہد بھی ان کے ہمراہ تھے۔ میں نے اپنے مسائل ان کے سامنے رکھے۔ انہوں نے مسائل حل کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ ہم سے ملاقات کے بعد وہ دوسرے علاقے میں چلے گئے اور ہم سری نگر کی نواحی بستی کھن بر چلے گئے۔ یہاں ایک بہت بڑا GOAT-FARM تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر کی زرعی یونیورسٹی بھی اسی گاؤں میں قائم ہے۔ ہم یونیورسٹی میں چلے گئے، ارد گرد حفاظتی اقدامات کیے اور رات یونیورسٹی کے مہمان خانے میں قیام کیا۔

صبح ہم یوشامہ میں گئے جہاں کبھی ہمارے دو زخمی ساتھی کنگن سے سری نگر پہنچانے کے لیے لائے گئے تھے۔ دو دن تک ہم اس بستی میں رہے۔ یہ بستی اپنے خوبصورت باغات کی وجہ سے کافی مشہور ہے۔ مجاہد ٹولیوں میں بٹ کر مختلف گھروں میں کھانا کھا لیتے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کسی ایک گھر پر بوجھ بنیں۔ پہاڑ بستی سے بہت دور تھے، اس لیے شب ب سری کے لیے ہم گھروں سے ایک ایک دو دو بستر لے لیتے اور سیب کے باغوں میں پہرہ لگا کر سو جاتے۔

تیسرے دن کی بات ہے..... ہم بستی کے باغات میں گھوم رہے تھے کہ سیبوں کے باغ کے درمیان میں ایک خوبصورت دو منزلہ مکان دکھائی دیا۔ ابھی ہم اس جگہ تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم مکان کی طرف دوڑ پڑے۔ مکان میں صرف ایک ملازم تھا۔ شدید بارش کی وجہ سے اسی مکان میں شب ب سری کرنی پڑی۔ ملازم نے خوشی سے رات گزارنے کی اجازت دے دی۔ کھانا ہم نے بستی کے قریبی گھروں سے منگوا کر کھایا اور سونے سے قبل پہرے کا اہتمام کر لیا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔ میں نے اپنے سونے کے لیے

مکان کی بالائی منزل کا ایک کمرہ منتخب کیا تھا۔

علی الصبح نماز فجر کے لیے اٹھا۔ سنتیں پڑھ چکا تھا اور فرائض کی نیت باندھ ہی رہا تھا کہ ذوالفقار بھائی دوڑتے ہوئے آئے اور ”مرثدہ“ سنایا۔۔۔۔۔ ”فوج مکان کے دروازوں تک پہنچ گئی ہے۔۔۔۔۔ سینکڑوں فوجیوں نے مکان کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔“ میں نے کہا کہ فرض پڑھ لوں، اس دوران آپ نیچے جا کر اچھی طرح دیکھ لیں کہ فوج کہاں کہاں اور کتنی ہے۔ وہ چلے گئے تو میں دو رکعتیں فرض ادا کر کے نیچے اتر ا۔ فوجی گھر کے باہر دور دور تک دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پیکا اور پوچ وغیرہ سنبھالا۔ سب ساتھی لڑنے اور باہر نکلنے کے لیے تیار تھے۔ دو منٹ میں انہیں میں نے اپنے منصوبے سے آگاہ کر دیا۔ میں نے ساتھیوں سے کہا۔۔۔۔۔ ”سب سے پہلے میں نکل کر باہر جاتا ہوں۔ اگر فوج نے مجھ پر فائر کیا تو آپ لوگ کھڑکیوں سے ان پر فائر کھول دیں اور ایک ایک کر کے نکلنے کی کوشش کریں۔ اگر مجھ پر فائرنگ نہیں ہوتی تو پھر میں اشارہ کروں گا“ اس کے فوراً بعد ساتھی ایک ایک کر کے نکلتے ہوئے زرعی یونیورسٹی کی جانب چلے جائیں۔“

یونیورسٹی وہاں سے دو کلومیٹر دور تھی۔ باغات کی دوسری طرف کھیل کا میدان تھا، اس کے ساتھ بستی تھی۔ رات کے وقت جن مقامی باشندوں کو ہم نے پہرے پر رکھا تھا، وہ فوج سے خوف زدہ ہو کر کھسک گئے تھے، اور ہمیں مطلع بھی نہیں کر سکے۔ فوج پہلے تو بڑی دیدہ دلیری سے مکان کے پاس پہنچ گئی لیکن جب ہمارے ساتھیوں کو کھڑکی میں گتیں لیے کھڑا دیکھا، تو اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر باغ میں پوزیشنیں لینے لگی۔ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے کر میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے باہر نکلا۔ سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ میں بڑے اعتماد سے پیکا لیے مکان کے دروازے سے نکلا اور بیس میٹر

کے فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے کمانڈو وردی پہن رکھ تھی اور میری انگلی پیکا کے ٹرائیگر پر تھی۔ مجھ سے تیس میٹر کے فاصلے پر سامنے نالیوں میں فوجی پوزیشنیں لے کر لیٹے ہوئے تھے۔ حد نظر تک ان فوجیوں کے سر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنے سامنے کے فوجیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ وہ بت بنے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ خوف زدہ تھے، گنوں پر ان کی گرفت واضح طور پر ڈھیلی ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کچھ نے اپنی گنوں کا رخ آسمان کی طرف کر لیا۔ یہ میرے لیے پیغام تھا کہ ہم لڑنے مرنے کے لیے نہیں آئے، صرف احکامات کی پابندی کی رسم پوری کر رہے ہیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تیس میٹر کے فاصلے پر کچھ فوجی میری طرف گنیں تان کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں بھی اعصابی جنگ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے ارادے بھی سامنے کے فوجیوں سے مختلف نظر تھے۔ فوجیوں کے دونوں گروپوں کے درمیان ساٹھ میٹر کا فاصلہ تھا اور میں ان کے بالکل وسط میں بیٹھا انہیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ میری انگلی ٹرائیگر پر تھی اور میرا پیغام بھی واضح تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی مجھے یقین ہو گیا کہ فوجی میری طرح خوف زدہ ہیں اور حملے سے دامن بچا رہے ہیں۔

میں نے بیٹھے بیٹھے ساتھیوں کی طرف دیکھے بغیر انہیں نکلنے کا مخصوص اشارہ کیا۔ پہلا ساتھی نکلا اور تیزی سے چلتا ہوا میرے پاس آ کر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔۔۔ ”سامنے کی طرف سے نکلو۔“ وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نکل گیا۔ اب میں نے دوسرے ساتھی کو اشارہ کیا وہ بھی میرے قریب سے ہوتے ہوئے نکل گیا۔ میں ایک ایک کر کے ساتھیوں کو آگے روانہ کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے تک ایک کے سوا سب ساتھی جا چکے تھے۔ آخری ساتھی کو میں نے اشارہ کیا اور اس نے مجھ سے بیس میٹر کے فاصلے پر

جا کر پوزیشن لے لی۔ اب میں اٹھا اور ساتھی کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے چلا گیا۔ پچاس میٹر کے فاصلے پر میں نے رک کر فوجیوں پر پیکا تانی اور ساتھی کو اشارے سے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گن تانے میرے پاس خیریت سے پہنچ گیا۔ ہم دونوں خراماں خراماں چلتے ہوئے باغات سے باہر نکل گئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں فوج باغات میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ فوجی ہمیں دیکھ کر آنکھیں چرا لیتے۔ فوجیوں کی بزدلی دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ ان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا، وہ ہلنے جلنے سے بھی ڈر رہے تھے، کہیں ہم ان پر فائر نہ کر دیں۔ باغات سے باہر سارے ساتھی ہمارا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، میں ان کو لے کر زرعی یونیورسٹی کی طرف چل پڑا۔

یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے ہلکی بوندا باندی موسلا دھار بارش میں بدل گئی تھی۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم یونیورسٹی کے برآمدوں میں پھیل گئے۔ ہمارے کپڑے بارش سے بھیگ چکے تھے۔ سب ساتھی کپڑے نچوڑ رہے تھے، اس دوران یوشامہ کی مسجد سے اعلان سنائی دینے لگا۔ گاؤں کے تمام افراد کو سکول گراؤنڈ میں شناخت پریڈ کے لیے جمع ہونے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ فوجی کہہ رہے تھے: ”کوئی فرد گاؤں سے باہر نہ جائے.... فوج نے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا ہے۔“ ”بہادر“ فوج کو یقین ہو گیا تھا کہ مجاہدین چلے گئے ہیں، اس لیے اب بے گناہ لوگوں کو مشق ستم بنانے میں کوئی حرج نہ تھا۔ یہ اعلان سن کر میں نے ساتھیوں سے کہا ہم کسی دوسری مسجد سے اعلان کرتے ہیں کہ بھارتی فوج ہمارے محاصرے میں ہے، اس لیے ہتھیار ڈال دے، تاہم بارش کی شدت نے ہمیں اپنے پروگرام پر عمل درآمد سے روک لیا۔

نوبت یونیورسٹی سے نکلے اور ایک گھنٹے کے بعد کھن برپہ ہوئی۔ یہ ایک جدید اور خوبصورت بستی ہے۔ یہاں کی اکثریت نیشنل کانفرنس سے تعلق رکھتی ہے۔

خوبصورت اور عالیشان مکان لوگوں کی خوشحالی کی داستان سناتے ہیں۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا تاہم بازاروں میں چہل پہل تھی۔ میں نے چند گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے اور بارش سے بچنے کے لیے ان سے مدد مانگی، لیکن سب سراپا انکار تھے۔ میں ان کے رویے سے بڑا مایوس ہوا۔ کشمیر میں آج تک ہمارے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ان کے انکار کو خاموشی سے سن کر میں اپنے ساتھیوں کو لے کر قصبے کے چوک میں چلا گیا۔ یوشامہ سے چھترہامہ جانے والی سڑک اسی چوک سے گزرتی ہے۔ ڈل اور حضرت بل یہاں سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ سری نگر سے آنے والی سڑک بھی اسی چوک میں آکر ملتی ہے۔ چند مقامی مجاہدین بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ ان کی مدد سے میں نے اس چوک کی طرف آنے والی تمام سڑکوں کو بند کر کے ان پر ایک ایک مسلح مجاہد تعینات کر دیا۔ چوک کے ایک طرف آبادی تھی۔ آبادی کی دو گلیاں اتنی کشادہ تھیں کہ ان میں سے چھوٹی گاڑیاں آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ ہم نے انہیں بھی بند کر دیا۔ اس چوک کی طرف آنے والے سارے راستے بند ہو گئے تھے اور چوک پر ہمارا قبضہ تھا۔

چوک میں ہم نے گتیں فٹ کر دیں۔ چند منٹ میں ہماری اس کارروائی کی خبر سارے قصبے میں پھیل گئی۔ لوگ بری طرح خوف زدہ ہو گئے۔ روڈ بند تھے اس لیے فوج نے مقابلے کی صورت میں مارٹر فائر کرنے تھے جس سے مکانوں اور مکینوں کی تباہی یقینی تھی۔ ہر طرف افرا تفری کا عالم تھا۔ جن کے پاس گاڑیاں تھیں انہوں نے بال بچے گاڑیوں میں لادے اور سری نگر کی راہ لی۔ ہم نے ان کے لیے راستہ کھلا رکھا تھا۔ دوسرے بسوں اور گاڑیوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں سارا قصبہ سڑکوں پر اٹھ آیا اور مکان خالی ہونے لگے۔ ہم نے سری نگر جانے والوں سے کہا کہ وہ راستے میں پڑنے والے کیمپوں کے فوجیوں کو بتادیں

کہ ہم یہاں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہماری موجودگی کی خبر سن کر قریبی گاؤں میں موجود فوج بھی کیمپوں میں واپس چلی گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے لوگ ہمارے پاس آنے شروع ہو گئے۔ ایک کہتا شاہین بھائی! آپ بارش میں یہاں کیوں بھیگ رہے ہیں، میرے گھر تشریف لائیے۔۔۔۔۔ دوسرا کہتا آپ ہمارے مہمان ہیں، میرے گھر پر چائے نوش کریں۔۔۔۔۔ تیسرا کھانا کھانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ ساتھ ہی دبے لفظوں میں فوج کی آمد کے خوف کا بھی اظہار کرتے اور روڈ کھولنے کی درخواست بھی کرتے۔ میں نے کہا۔۔۔ ”جب ہم بھوکے پیاسے بارش میں بھیگتے ہوئے آئے تھے تو آپ نے سرد مہری دکھائی اور ہمیں ایک گھونٹ پانی دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اب منت سماجت کر رہے ہیں، ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے لیکن سڑکوں پر قبضہ ہم برقرار رکھیں گے۔۔۔۔۔ فوج کی جرات ہے تو ہم سے چھڑا لے۔“

قریبی گاؤں کے مجاہدین اپنے گھروں سے برتن، سبزی، گوشت اور لکڑی وغیرہ لے آئے۔ چوک میں دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے ایک شیڈ بنا ہوا تھا۔ ہم نے اس شیڈ تلے چولہا بنا کر کھانا تیار کیا۔ دو بجے ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر بعد ایک وفد آیا جس میں پروفیسرز اور اعلیٰ سول حکام تھے۔ انہوں نے ہم سے چوک خالی کرنے اور سڑکیں کھولنے کی استدعا کی۔ میرا دل تو ان نیشنل کانفرنسیوں کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا، لیکن بعض معمر لوگوں کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے ان کی بات مان لی۔ لیکن ان سے یہ عہد لیا کہ آئندہ جو بھی مجاہد آئے گا، اسے نہ صرف وہ پناہ دیں گے بلکہ اس کے طعام و قیام اور پہرے کا بھی بندوبست کریں گے۔ سب نے یک زبان ہو کر مجھ سے وعدہ کیا۔

تین بجے ہم وہاں سے نکل کر گاؤں کے مضافات کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن

راستے میں ایک بار پھر تیز بارش نے آلیا۔ مجبوراً ہمیں گاؤں واپس لوٹنا پڑا۔ ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو لوگوں کے چہروں پر پھر خوف کے سائے لہرانے لگے، لیکن معاہدے کے تحت وہ ہمیں گھروں میں پناہ دینے پر مجبور تھے۔ لوگ سری نگر سے واپس گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ چند گھنٹے ہم نے وہاں بارش رکنے کا انتظار کیا۔ شام کے وقت ہم دوبارہ یوشامہ کی طرف چل دیئے۔ اگلے روز فوج نے کھن بر کا وسیع پیمانے پر کریک ڈاؤن کیا اور بھارت کے ہمدرد نیشنل کانفرنسیوں کی بھی خوب پٹائی کی۔ ان میں اعلیٰ سول حکام اور بڑے بڑے تاجر بھی تھے۔ یہ سلوک اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ بھارت سے چاہے جتنی بھی محبت جتائی جائے، اس کی جتنی بھی چالوسی کی جائے، کشمیری مسلمانوں کے لیے اس کا اعتماد حاصل کرنا ممکن نہیں۔

یوشامہ پہنچ کر اس کے مرکزی چوک میں ہم نے پڑاؤ ڈالا، بارش ختم چکی تھی، چند مقامی مجاہدین ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے کھانے کا بندوبست کیا اور ہمدردوں کے گھروں سے بستر وغیرہ اکٹھے کر کے سونے کا انتظام کیا۔ پہرے کا بندوبست کر کے ہم دکانوں کی چھتوں پر ہی سو گئے۔ اگلا دن بھی ہم نے یہیں گزار دیا۔ ساتھیوں نے بازار سے ریکٹ اور شٹل کاک خرید کر بیٹمنٹن کھیلنا شروع کر دی، جبکہ دوسرے ساتھی دکانوں کی چھتوں سے ان کا کھیل دیکھتے اور داد دے رہے تھے۔

دس بجے ہم کھل مولا کی طرف روانہ ہوئے۔ بارش چند دن تک خوب برسنے کے بعد ختم چکی تھی۔ سورج کی اجلی اور چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ چالیس افراد پر مشتمل ہمارے قافلے میں مقامی مجاہدین اور بالائے زمین کام کرنے والے ساتھی بھی شامل تھے۔ بھارتی فوج کو ہماری نقل و حرکت کا علم تھا لیکن اسے قریب آنے کی جرات نہیں تھی۔ ایک مرتبہ محاصرے میں ہزیمت

اٹھانے کے بعد اس نے ہماری طرف سے کان بند کر لیے تھے۔ ہم بڑے اطمینان سے سفر کر رہے تھے۔ یہ پورا علاقہ قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں واقع وسیع و عریض وادی میں دور دور تک سیبوں کے باغات ہیں۔ درختوں سے سیب اتارے جا رہے تھے، اس لیے باغوں میں رونق اور چہل پہل پورے عروج پر تھی۔

کھل مولا پہنچ کر ہم نے ایک باغ میں پڑاؤ ڈالا جس کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ ہم سستانے کے لیے ابھی باغ کی سرسبز گھاس پر دراز ہی ہوئے تھے کہ بستی کے درجنوں چھوٹے بڑے لڑکے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ یہ خوشگوار حقیقت اب میرے لیے نئی نہ تھی کہ کشمیر کی نئی نسل کو تحریک آزادی، مجاہدین اور جہاد سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہے۔ بڑی عمر کے لوگ احتیاطاً ہم سے دور رہتے ہیں جبکہ ہر جگہ نوجوان ہمارے پاس آتے، بڑی محبت اور چاؤ سے ملتے اور ہماری چھوٹی موٹی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہتھیاروں کو دیکھ کر اور ان سے کھیل کر انہیں غیر معمولی خوشی ہوتی ہے۔ ہتھیاروں سے انہیں بے حد دلچسپی ہے۔ وہ ہم سے گنوں کے متعلق مختلف سوالات کرتے ہیں۔

کھل مولا میں تھوڑی دیر میں لڑکوں نے سیب لا کر ڈھیر لگا دیا اور ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ یہ کشمیر کے بہترین سیب تھے۔ ہم نے جی بھر کر کھائے۔ اس کے بعد ذکی بھائی نے تمام لڑکوں کو ایک بڑے سے دائرے میں بٹھا کر ”محفل ترانہ“ منعقد کی۔ گفتگو کے دوران مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ سب تحریک جہاد سے پوری طرح باخبر ہیں۔ میرے نام اور کام سے بھی واقف تھے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ مجھ سے ملنے کی وہ بڑی تڑپ رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پاکستان کے

متعلق عجیب و غریب سوالات کیے مثلاً کیا پاکستان میں گاڑیاں چلتی ہیں۔۔۔؟ کیا وہاں بجلی ہے۔۔۔؟ کیا وہاں پکے گھر ہیں۔۔۔؟ ایک لڑکے نے پوچھا "کیا پاکستان میں آلو اور ٹماٹر پیدا ہوتے ہیں۔۔۔؟ یہ سن کر بہت حیرت ہوتی تھی۔ یہ سب دراصل ہندوستان کے منفی اور منظم پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان کے اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا سے دن رات پاکستان کو غریب اور دہشت گرد ملک کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ان جھوٹے تبصروں سے قلب و ذہن میں پاکستان کا جو نقشہ بنتا ہے وہ کسی طرح سے بھی خوبصورت اور دل پسند نہیں ہوتا۔ اس روز بھی میں دیر تک ان لڑکوں کو پاکستان کی اصل حقیقت سے آگاہ کرتا رہا۔ انہوں نے بڑی توجہ سے میری باتیں سنیں اور حقیقت جاننے کے بعد بہت شرمندگی کا اظہار کیا۔ باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنی غلامی کا شدید احساس ہے۔ ان کی ہریات سے ہندوستان سے نفرت اور آزاد فضاؤں میں رہنے کا اظہار ہو رہا تھا۔ آزادی کو کچلنے کے لیے ظلم و تشدد کے بدترین حربے استعمال کیے جانے سے وہ ہندوستانی حکومت سے بری طرح متنفر ہو گئے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں انتقام کے شعلے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان لڑکوں سے جب میں یہ رسمی سوال پوچھتا کہ وہ بڑے ہو کر کیا بنیں گے۔۔۔؟ تو سب کا جواب ایک ہی تھا۔۔۔ "مجاہد بنیں گے۔"

نماز عصر کے بعد ہم نے لڑکوں کو جمع کر کے بتایا کہ ان کا ایک امتحان ہو گا۔ جو لڑکا اس میں کامیاب ہو گا اسے ہم عسکری تربیت کے لیے بھیجیں گے اور وہ جلد ہی مجاہد بن جائے گا۔

اس کے بعد ہم نے ان کا ایک "دلچسپ" امتحان لیا۔ ہم مختلف جگہ چادریں باندھ کر لڑکوں کو دکھاتے اور کہتے "انہوں نے رینگ کر اور چھلانگ لگا کر ان

چادروں سے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گزرنا ہے۔ طریقہ کار سمجھانے کے بعد ہم نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی، ساتھ ہی چادریں ہٹا دیں۔ لڑکے بڑی جدوجہد اور شوق سے ریگتے اور چھلانگیں لگاتے رہے، حالانکہ وہاں چادریں نہیں تھیں، مگر وہ یہ سمجھ کر خوش ہوتے رہے کہ چادروں کو چھوئے بغیر چھلانگیں لگانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ایک گھنٹے تک یہ مشق جاری رہی۔ اس کے بعد ہم نے ایک درجن سرپا شوق لڑکے چنے اور انہیں بیس کیمپ بھجوانے کا انتظام کیا۔

ان دلچسپ مشاغل کے بعد ہم کھل مولا سے روانہ ہو گئے۔ ایک پہاڑی کو عبور کرنے کے بعد گاندربل کے علاقے نونر میں اتر گئے۔ پورے سفر کے دوران ساتھیوں کی گپ شپ عروج پر رہی جس سے بیس کلومیٹر کی مسافت کا احساس تک نہ ہوا۔ نونر کو چناروں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے۔ پچاس کے قریب بلند و بالا چنار دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے وائرلیس کے ذریعے مقامی مجاہدوں کو اپنی آمد کے متعلق بتا دیا تھا۔ چنانچہ مجاہدین ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے ہمارے کھانے کے لیے خاصا پر تکلف اہتمام کر رکھا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے بھوک مٹائی، اس کے بعد لمبی تان کر سو گئے۔

پھر میدان گرم ہو گیا

اگلے دن ہم وہاں سے گاندربل کے ایک اور قصبے ورپش پہنچے۔ دن بستی میں گزار کر رات پہاڑی ٹھکانے پر چلے گئے۔ عادل شہباز، شہباز، عمر انقلابی اور سیف اللہ کی خواہش تھی کہ وہ گاندربل کے علاقے میں ہی قیام اور کام کریں۔ ان دنوں گاندربل میں مجاہدین کا راج تھا۔ میں نے ان کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کیا، وہ مقامی مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے۔ میں اپنے پرانے ٹھکانے کنگن جانا چاہتا تھا۔ کشمیری مجاہدین کا ایک دوسرا گروپ، جس میں آٹھ مجاہدین شامل تھے، کو میں نے کنگن روانہ کر دیا۔ ذوالفقار بھائی، زمر گل بھائی، شیردل بھائی اور ذکی بھائی سمیت چند مجاہدین نے منی گام جانے کی ٹھان لی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کارروائیوں کے آغاز پر ان کو مطلع کروں گا۔ ان کے پاس ایک وائرلیس سیٹ بھی تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ کنگن پہنچ کر ایکشن پلان بنا کر انہیں آنے کی دعوت دوں گا۔

صابر بھائی کے کزن حافظ اصغر نے پاکستان سے وادی میں پہنچ کر انہیں پیغام بھیجا تھا کہ وہ اسلام آباد کے علاقے میں ان سے آ ملیں۔ صابر بھائی اسلام آباد

روانہ ہوئے تو مصعب بھائی بھی ان کے ہمراہ چلے گئے۔ ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ صابر بھائی کو اسلام آباد کے علاقے میں حافظ اصغر کی شہادت کی خبر مل گئی۔ اس طرح شہید بھائی سے ملنے کی حسرت دل میں لیے وہ مصعب بھائی کے ہمراہ سوپور چلے گئے۔ جہاں بعد ازاں وہ ایک دوسرے معرکے میں جام شہادت نوش کر گئے۔ ورپش سے ہی عطاء الرحمن بھائی اور ابوذر افغانی کے علاوہ چند مقامی مجاہد سیکشن کمانڈر سمیر خان کے پاس گٹل باغ چلے گئے۔

ورپش میں ہم نے پانچ دن تک قیام کیا۔ ہمارے بہت سے پاکستانی اور مقامی ساتھی ہم سے الگ ہو کر مختلف منازل کی طرف روانہ ہو گئے تھے، ہم ان کے لیے افسردہ ہوئے لیکن ہم سب کا مقصد اور کام ایک ہی تھا۔ اب میرا گروپ سکڑ کر پانچ مجاہدوں تک محدود ہو گیا تھا۔ میرے ساتھیوں میں طاہر سلیم، عرفان، ابن سیفل اور محمود غزنوی شامل تھے۔ ساتھیوں کی روانگی کے چند دن بعد ایک صبح چند مقامی ساتھیوں نے بستی کے ایک کنارے پر ہمیں خدا حافظ کہا اور ہم کنگن کی طرف روانہ ہو گئے۔ نالہ سندھ کے کنارے کنارے فوجی کیمپوں سے دور رہ کر کچے راستے پر چلتے اور مختلف بستیوں میں رکتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ لوگ روایتی محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ چار دن تک ہم محو سفر رہنے کے بعد کنگن کے علاقے ٹنگ چھتر میں اپنے پہاڑی ٹھکانے پر پہنچے۔

ہم ایک ماہ بعد کنگن واپس لوٹے تھے۔ ہمارے پیچھے یہاں ایک الم ناک واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ کنگن کے چار مجاہدوں نے ٹنگ چھتر کے پہاڑ پر اپنی کمین گاہ بنالی تھی۔ ان میں کنگن کے لس خان، گامی، ٹنگ چھتر کے نذیر احمد اور بی چھامہ کے نذیر احمد شامل تھے۔ ایک روز رات گئے ان کی پہاڑ پر موجودگی کی مخبری ہو گئی۔ بھارتی فوج نے مخبر کی رہنمائی میں ان کی کمین گاہ کا محاصرہ کر لیا۔ چاروں مجاہد گہری

نیند سوئے ہوئے تھے اور ان سے یہ مہلک غلطی ہوئی کہ انہوں نے پہرے کا انتظام بھی نہیں کیا تھا۔ فوجیوں نے بلند آواز میں انہیں خود کو فوج کے حوالے کرنے کا حکم دیا، لیکن نیند نے انہیں سلائے رکھا۔ پھر فوجی گنیں تانے ان کی کمین گاہ میں داخل ہوئے اور چاروں کو سوتے میں گولی مار کر ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ المناک واقعہ سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔ یہ چاروں شہدائے کرام میرے جاننے والوں میں سے تھے۔

ہم نے ٹنگ چھتر کے جنگل میں ایک ہزار میٹر کی اونچائی پر ایک محفوظ جگہ پر ایک ٹینٹ میں نئی پناہ گاہ تیار کر لی۔ چولہے وغیرہ تیار کر کے کھانے پینے کا بندوبست بھی کر لیا۔ ادھر فوج کو ہماری واپسی کی اطلاع مل گئی تھی۔ پناہ گاہ ایک ایسی چٹان کے سرے پر بنائی تھی جہاں لیٹے لیٹے ہم ٹنگ چھتر میں معمولی نقل و حرکت کو بھی صاف دیکھ سکتے تھے مگر ہم خود دوسروں کی نگاہوں سے او جھل تھے۔ اگلے دن ہم علی الصبح نماز فجر کے لیے اٹھے، نیچے دیکھا تو پوری بستی میں فوج نے کریک ڈاؤن کیا ہوا تھا۔ چاروں طرف فوجی گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ٹینٹ گرا کر ہم دوبارہ سو گئے۔ نو بجے جاگ کر نیچے دیکھا تو فوجی ابھی تک گھروں کی تلاشی میں مصروف تھے۔ ہم ان سے چار سو میٹر دور ایک محفوظ اور چھپی ہوئی جگہ پر تھے، اس لیے انہیں ہمارا کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں ہیں۔ محمود غزنوی نے ناشتہ تیار کرنے کے لیے چولہے پر کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں کہا..... آپ چائے تیار کریں، میں پہلے ذرا ”ناشتہ“ کر لوں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا، کون سا ناشتہ۔۔۔؟ میں نے کہا، ابھی دکھاتا ہوں۔ میں نے کمین گاہ ہی کے ایک پتھر پر سنائپر فٹ کی۔ اب دن کے دس بج گئے تھے اور فوجیوں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ وہ نالہ سندھ کا پل عبور کر کے سامنے کیمپ میں جا رہے تھے۔ پل پر سے گزرنے والے چند فوجیوں میں

سے ایک کا نشانہ لے کر میں نے فار کر دیا۔ وہ پل پر ہی گر پڑا، دوسرے فوجیوں نے پل پر ہی پوزیشنیں لینے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے پل پر کوئی آڑ نہ تھی جس کے پیچھے وہ پوزیشن لیتے۔ اگلے ہی لمحے میں نے دوسرے، پھر تیسرے اور چوتھے فوجی کو نشانہ بنایا۔ چاروں گولیاں ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگیں۔ تین فوجی تو گرنے کے بعد دوبارہ نہیں اٹھ سکے، البتہ چوتھے نے ہمت دکھائی اور زخمی حالت میں ہی پل عبور کر کے دریا کے کنارے ایک پتھر کی اوٹ میں لیٹ گیا۔ طاہر اور عرفان بھائی یہ منظر دو رہیں سے دیکھتے ہوئے ساتھ ساتھ کمٹری بھی کر رہے تھے۔ فوجیوں میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کوئی ادھر بھاگ رہا ہے، تو کوئی ادھر۔ کوئی کسی پتھر کے پیچھے چھپ رہا ہے تو کوئی کسی درخت کی آڑ میں گن تانے اندھا دھند فارنگ کر رہا ہے۔

قدرے سنبھلنے کے بعد ان کا افسر میگافون کے ذریعے چلایا ”اگر وادی گاؤں میں موجود ہیں، انہیں پکڑ لو“ اس نے غصے اور خوف کے ملے جلے لہجے میں چیخ کر کہا۔۔۔ ”پاکستانیو.....! ہتھیار پھینک دو ورنہ۔۔۔۔۔ کی موت مارے جاؤ گے۔ تم چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو، خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“

ہم نے یہ گیدڑ بھکی سنی اور ہنس دیے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ فار اسی گاؤں سے ہوا ہے جس کی تلاشی کے بعد وہ واپس آرہے تھے۔ ندی میں پانی کم تھا اور اس کا پاٹ بھی چوڑا تھا، پھر بھی اس کے تخی بستہ بہاؤ میں سے مشکل سے ہی کوئی فرد گزر سکتا تھا، مگر اب کسی فوجی میں دوبارہ پل پر سے گزرنے کی ہمت نہ تھی اس لیے افسر کے حکم پر واپسی پر پانی میں سے گزرنے لگے۔ کچھ ہمارا خوف تھا، کچھ پانی کی تیز و تند لہریں تھیں، قدم ایک جگہ رکھتے تو پڑتا کسی دوسری جگہ پر تھا۔ پانی میں گرتے پڑتے اور بھیکتے ہوئے انہوں نے ندی کو عبور کیا اور دوبارہ گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔

”بہادر“ افسر ابھی تک ندی کے اس پار سے میگافون پر فوجیوں کو ہدایات اور

ہمیں دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ فوج کے ہمراہ گاؤں آتا۔ فوجیوں نے ایک بار پھر گاؤں کے نہتے اور بے گناہ افراد کو باہر نکال کر شناخت پریڈ کے لیے بٹھا دیا اور سارے گھروں کو از سر نو کھنگالنے لگے۔ حالانکہ فوجیوں کو علم ہو چکا تھا کہ ہم کہاں ہیں، لیکن ان میں ہمت نہیں تھی کہ ہم سے چھیڑیں۔ سارا دن ان کا دکھلاوے کا یہ سرچ آپریشن جاری رہا، لیکن ہم گاؤں میں ہوتے تو ان کو ملتے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اپنی کمین گاہ میں تیار کر کے کھایا۔ جب سورج نیچے دامن کوہ میں واقع بستیوں سے رخصت ہو کر پہاڑوں پر اپنی الوداعی کرنیں بکھیر رہا تھا تو فوجی افسر نے محاصرہ اٹھانے کا حکم جاری کر دیا۔ تھکے ماندہ اور شکست خوردہ فوجی ہمیں اور ہم سے زیادہ اپنے افسر کو کوستے ہوئے بو جھل قدموں سے واپس چل دیے۔

اگلے دن ہم نے متاثرہ گاؤں جا کر لوگوں کا حال احوال پوچھا۔ ان کا مورال بلند تھا۔ تیسرے دن کو ٹلی ستیاں کے نصیر بھائی وادی سے ہو کر میرے پاس پہنچے۔ میں نے ان سے وادی کے تازہ حالات معلوم کیے۔ انہوں نے میجر مست گل کی نیک خواہشات کا پیغام بھی پہنچایا اور کہا، وہ بھی کنگن آنے کے خواہش مند ہیں۔ نصیر بھائی مجھ سے چند معلومات لینے آئے تھے، اپنا مشن مکمل کرنے کے بعد وہ دوسرے روز عصر کے بعد واپس روانہ ہو گئے۔

نصیر بھائی کو دو مقامی ساتھیوں کے ہمراہ بھیجے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اچانک تینوں مجاہد بھاگتے ہوئے واپس آتے دکھائی دیے۔ ایک ہٹاکٹا فوجی گن تانے ان کا پیچھا کرتے ہوئے اونچی آواز میں انہیں رکنے کا حکم دے رہا تھا۔ ہمیں علم نہ تھا کہ فوج نے ان کے راستے میں گھات لگائی ہوئی ہے۔ اس وقت میرے ہمراہ شالیمار کے نو عمر مجاہد یا سین بھی تھے۔ ہم نے فوراً چند فائر کیے، جس کی وجہ

سے فوجیوں نے ان کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ فوج کی اس جرات پر مجھے سخت طیش آیا۔
 میں نے سنائپر سنبھالی اور ساتھیوں کو لے کر ایک اونچے مقام پر چڑھ گیا۔ کچھ ہی
 دیر بعد سندھ ندی کے معلق پل پر سے چند فوجی جاتے دکھائی دیے۔ میں نے فوراً
 ایک کو ڈھیر کر دیا، اس کے بعد دوسرے کو بھی وہیں لٹا دیا۔ ابن سیفل میرے پہلو
 میں لیٹے ہوئے تھے۔ اس طرح فوجیوں کو آسانی سے شکار ہوتے دیکھ کر ان کے منہ
 میں پانی بھر آیا۔ انہوں نے گن لے کر چند فائر کیے لیکن نشانے پر ایک بھی نہ لگا۔
 میں نے دور بین انہیں تھما کر دوبارہ گن لی اور پتھر کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے دو مزید
 فوجیوں کو نشانہ بنایا۔ فوجیوں کی اکثریت اب سرا سیمہ ہو چکی تھی۔ فوجی میدان کے
 کونے پر واقع واٹر سپلائی اور فشریز کے ان دفاتر کے کھنڈرات میں پناہ لے رہے تھے
 جنہیں مقامی لوگوں نے ہماری موجودگی میں اس سال کے ابتدائی دنوں میں جلا ڈالا
 تھا۔ وہ اندھا دھند گاؤں پر فائرنگ کر رہے تھے، لیکن اللہ کے فضل سے گاؤں کے
 کسی مکین کو کوئی گزند نہیں پہنچی، تاہم مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سوراخ
 ہوئے۔ ہم نے گن کرچودہ فائر کیے تھے جن میں سے سات تو ضائع گئے، باقی گولیوں
 سے چار فوجی ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔ مغرب کے بعد فوج اپنی اپنی پوزیشنوں
 سے اٹھی اور زخمیوں کو لے کر کیمپ کی طرف چلی گئی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر ہم
 دوبارہ نصیر اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر چل پڑے۔ ایک کلومیٹر کے سفر کے بعد
 ایک محفوظ مقام پر انہیں خدا حافظ کہا اور واپس اپنی کمین گاہ پر لوٹ آئے۔

جنگ بندی کے طالب

میری دعوت پر گاندر بل اور منی گام کے ساتھی گٹل باغ پہنچ چکے تھے۔ ان میں ذکی گوریلا، عادل شہباز، عمر انقلابی، ذوالفقار، زمر وگل، سلیم اکبر اور دوسرے ساتھی شامل تھے۔ چند ساتھی منی گام میں لانچنگ کے کام کی وجہ سے رک گئے تھے۔ اگلے روز علی الصبح وائرلیس سیٹ کے ذریعے اطلاع ملی کہ کنگن میں روزنامہ ”آفتاب“ کے رپورٹر غلام محمد لون اور ان کے آٹھ سالہ بیٹے کو بھارتی فوج کے ایک میجر بال کرشن نے رات کے وقت گھر میں داخل ہو کر شہید کر دیا ہے۔ یہ خبر سن کر سب ساتھی غمگین ہو گئے۔ جناب غلام محمد ہماری کارروائیوں کو اخبارات کی زینت بنانے میں کمال جرات سے کام لیتے تھے۔ تحریک جہاد سے ان کی ہمدردی اور دلچسپی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میرے جاننے والوں میں سے تھے اور نہایت ہی خلیق اور ملنسار شخص تھے۔ میں نے رخت سفر باندھا اور تیزی سے چلتا ہوا بارہ کلومیٹر کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے کر کے دس بجے ٹنگ چھتر پہنچا۔ لون شہید کے گھر جا کر ان کے اہل خانہ سے تعزیت کی اور واقعے کی تفصیل سنی۔ معلوم ہوا ان کا ”جرم“ یہ تھا کہ انہوں نے ہمارے ان چار مقامی ساتھیوں کی شہادت کی

خبر اپنے اخبار میں شائع کرائی تھی جو ہمارے سری نگر جانے کے بعد ٹنگ چھتر کی کمین گاہ میں شہید ہو گئے تھے۔ ان کو شہید کرنے والا میجر بال کرشن تھا۔ اس نے شہیدوں کی چار کلاشن کوفیس اور تین پستول بھی قبضے میں لے لیے تھے۔ لیکن حرص و لالچ کے مارے اس نے اعلیٰ افسروں کو صرف ایک گن اور پستول کی بازیابی کا بتایا تھا۔ لون صاحب کو اس کے کر توت کا علم تھا۔ انہوں نے اسلحے کی مکمل تفصیلات بھی اخبار میں دے دیں۔ اس طرح بال کرشن کا بھانڈا پھوٹ گیا اور اس کی انکوائری شروع ہو گئی۔ اس خبر کی اشاعت پر اسے لون صاحب پر سخت غصہ تھا۔ وہ رات کے وقت سادہ کپڑوں میں لون صاحب کے گھر گیا اور یہ کہہ کر ان کو بیٹھے سمیت شہید کر دیا کہ میرے خلاف خبر لگانے کا خمیازہ بھگتو۔

یہ المناک واقعہ سننے کے بعد میں دوسرے لوگوں سے ملا جن سے فوج کے معمولات کے متعلق کچھ نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ ٹنگ چھتر میں فوجی گیارہ بجے آتے اور چند گھنٹے گھروں کی چھتوں اور ارد گرد بیٹھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ اس دوران وہ مردوں کو گھروں سے جبراً نکال دیتے اور خواتین کو ڈرا دھمکا کر اپنے لیے چائے اور کھانا تیار کرواتے تھے۔ ایک مجاہد کی بیوی نے اپنے خون آلود ہاتھ دکھائے جو کھانا نہ پکانے پر فوجیوں نے زخمی کر دیے تھے۔ میجر بال کرشن ٹنگ چھتر سے پرنگ تک لداخ ہائی وے کی حفاظت پر مامور تھا۔ گاؤں میں آنے والے فوجیوں کا تعلق اسی یونٹ سے تھا۔ میری نظر اب بال کرشن پر تھی۔ انتقام کی چنگاریاں میرے تن بدن میں سلگ رہی تھیں، جنہیں مجاہد کی بیوی کے زخمی ہاتھوں نے مزید ہوا دے دی۔

ساتھیوں سے مشاورت کے بعد فیصلہ ہوا کہ ان فوجیوں کو ہر حال میں نشانہ بنایا جائے۔ میں نے عمر انقلابی، طاہر سلیم اور ذکی گوریلے کو ایک کچے راستے پر

گھات لگانے کی ہدایت کی۔ سیف اللہ اور شہباز کو ایک دوسرے راستے کی نگرانی پر پوزیشنیں لینے کے لیے کہا۔ ذوالفقار بھائی کو دو ساتھیوں کے ہمراہ ایک تیسرے راستے سے فوج کے داخلے کو روکنے کے لیے گھات لگانے کے لیے بھیج دیا۔ ہر طرف لمبی لمبی گھاس تھی، اس لیے گھات لگانے کے لیے بڑی آسانی سے جگہ مل جاتی تھی۔ اس کچے راستے کے ڈیڑھ کلومیٹر کے حصے پر میں نے ساتھیوں کو مختلف ٹولہوں میں تقسیم کر کے بٹھا دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں میں جا کر اپنے ساتھیوں کی بھوک مٹانے کی تدبیر کی۔ گاؤں کے چند لڑکوں کو مختلف جگہوں پر تعینات کر کے انہیں کہا کہ جیسے ہی فوجی آتے دکھائی دیں مجھے مطلع کر دیں۔ ساتھیوں کے لیے کھانا تیار ہو گیا تو چند مقامی لڑکوں کو کھانا دے کر ان پوزیشنوں کی طرف روانہ کر دیا جہاں جہاں وہ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ میں نے کھانا کھانے کے بعد گاؤں سے باہر قدم رکھے ہی تھے کہ ذکی گوریلا اور سمیر خان آتے دکھائی دیے۔ میں نے کہا، آپ کہاں سے ”نازل“ ہو گئے؟ انہوں نے غصے سے کہا۔ ”دو گھنٹے سے ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ نے بھی حد کر دی، کوئی اطلاع نہیں، ہم بہت فکر مند تھے اس لیے آپ کی تلاش میں آئے ہیں۔“

ابھی ذکی نے بات ختم ہی کی تھی کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے چونکا دیا۔ ہم تینوں نے بدک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اگلے لمحے جنگل کی طرف دوڑنے لگے جہاں ہمارے ساتھی گھات لگائے بیٹھے تھے۔

اب ساتھیوں کا حال سنیں۔ ہمارے ساتھیوں نے جب سیر ہو کر کھانا کھایا، تو تھکاوٹ اور مرغن کھانے کی وجہ سے سب اوٹکھنے لگے۔ فوجیوں نے گیارہ بجے آنا تھا، لیکن بارہ بجے کے بعد تک بھی جب نہ آئے، تو سب ساتھی یہ سوچ کر کہ اب فوج نے نہیں آنا ہے غافل ہو کر سو گئے۔ ایک بجے کے قریب پندرہ بیس فوجی

جنگل میں ایک پگڈنڈی سے نمودار ہوئے۔ خوش قسمتی سے ذوالفقار بھائی نے انہیں آتے دیکھ لیا۔ جوں ہی یہ فوجی ان کی رینج میں آئے تو انہوں نے فائرنگ کر دی، چند فوجی گر پڑے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سوئے ہوئے سنا تھی بھی ہڑبڑا کر جاگ گئے۔ ان کی پوزیشنیں ایسی تھیں جہاں سے وہ بھارتی فوج کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ تاہم گولیوں کی ڈڈ ڈڈ دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔

میں، ذکی اور سمیر خان ابھی تک جنگل سے دو سو میٹر کے فاصلے پر تھے۔ اپنی پیکا میں ساتھیوں کے پاس چھوڑ آیا تھا، اب مجھے اس کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے پاس صرف ایک پستول تھا۔ ہم مکئی کے کھیتوں کی آڑ لیتے ہوئے کھیتوں اور جنگل کے درمیان ایک بڑے میدان کے سرے پر پہنچ گئے۔ یہ میدان سو میٹر چوڑا اور تین سو میٹر لمبا تھا اور اس میں گھاس اور گھنٹی جھاڑیاں دور دورہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ فوجی کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے، لیکن فائرنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ قریب ہی ہیں۔ میں نے پتھروں کی اوٹ سے بلند آواز میں کہا۔۔۔ ”پکڑو ان فوجیوں کو۔۔۔ مارو، کوئی بچ کر نہ جانا پائے۔“ یہ ایک چال تھی، میں چاہتا تھا کہ ان کی پوزیشن کے بارے میں جان سکوں۔ چند لمحوں کے بعد چند فوجی دکھائی دیے۔ وہ بدحواس ہو کر ہماری طرف بھاگتے آ رہے تھے۔ میں نے فوراً آگے بڑھنے والے فوجی پر پستول سے فائر کر کے اسے ڈھیر کر دیا۔ دوسری طرف، ذکی نے گلاشن کوف سے دوسرے فوجی کو پھڑکا دیا۔ ہمارے اس حملے کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور باقی فوجی بری طرح خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے یہ جان لیا کہ چاروں طرف مجاہدین چھپے ہوئے ہیں۔ میں نے ساتھیوں کو سیٹ پر اطلاع دے کر اپنی پیکا گن بھی منگوا لی۔ تھوڑی دیر بعد راشد بھائی چھپے چھپاتے پیکا لے کر میرے پاس پہنچ گئے۔ پیکا یا کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ پیکا ہمیشہ میری قابل اعتماد دوست ثابت ہوتی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ سو فوجی ہماری گھات میں بری طرح پھنس چکے تھے۔ ہم ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے، اس لیے انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف سے نکلیں۔ ہم نے انہیں تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔ صرف ایک طرف سے راستہ کھلا تھا مگر وہ انہیں معلوم نہ تھا۔ میں ساتھیوں کے ہمراہ نالے سے تین سو میٹر کے فاصلے پر جھاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ میں بیٹھا چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اچانک مجھے چھ فوجی نالے کی طرف سے چھپتے چھپاتے نکلتے دکھائی دیے۔ میں نے پیرکا سے برسٹ مارا تو وہ سارے خون میں لت پت ہو کر گرے اور وہیں تڑپنے لگے۔ چاروں طرف سے فائرنگ ابھی تک ہو رہی تھی۔ کچھ دور ایک ٹیکری کی اوٹ میں چند بڑی گنیں نصب کر کے کچھ فوجی اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے، لیکن یہ محض خوف کے جال سے نکلنے کی تدبیر تھی۔ انہیں ابھی تک ہمارے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہم سے چند میٹر دور پانچ فوجی مرے پڑے تھے۔ ان کی گنیں اٹھانے کے لیے ذکی بھائی کرائنگ کرتے ہوئے ان لاشوں کی طرف بڑھے، لیکن گولیوں کی بارش کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم کچی دیواروں، گھاس اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے دیگر ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ دو گھنٹے تک دونوں اطراف سے شدید فائرنگ جاری رہی۔ ہم جنگل میں اونچے اور محفوظ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں سے ہم نے دور بین کے ذریعے فوجیوں کی حالت زار کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔ ڈرے سہمے فوجیوں نے اپنے درجن بھر مرے ہوئے ساتھیوں کی لاشوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ زخمیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ چاروں جانب دیکھتے ہوئے چل رہے تھے اور لاشوں کو اٹھانے کے بجائے گھیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر مرے ہوئے فوجیوں کو انہوں نے پل کے قریب چھپا

دیا اور خود شام ہونے کا انتظار کرنے لگے تاکہ اندھیرے میں پل عبور کر کے کیمپ میں جا سکیں۔ ہم اوپر سے ان کی ساری نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔ مغرب کے بعد انہوں نے افراتفری کے عالم میں لاشوں کو پل کے پار اتارا۔ اس کے فوراً بعد ہم گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے ہم نے ”میدان جنگ“ کا معائنہ کیا۔ جا بجا فوجیوں کے جوتے، ہیلیمٹ، کارتوسوں کے کھوکھے اور دوسری اشیاء بکھری ہوئی تھیں۔ زخمی اور مرنے والے فوجیوں کا خون بھی چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر گاؤں کے لوگ بھی اس طرف آنکے۔ انہوں نے شکست خوردہ فوجیوں کے جوتے اکٹھے کرنے شروع کر دیے۔ بچے بھی مختلف چیزیں اکٹھی کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ فوجیوں کی رسوائی کی باتیں سن کر قہقہے لگا رہے تھے۔ ہمیں افسوس تھا کہ بال کرشن اس حملے میں بچ گیا۔ اس دستے کا انچارج میجر بال کرشن ہی تھا، لیکن اسے جب ہماری موجودگی کا علم ہوا تو وہ پل عبور کر کے فوجی کیمپ میں جا چھپا تھا۔ وہاں سے سیٹ کے ذریعے فوجیوں کو ہدایات دیتا رہا۔ اس ساری کارروائی کے دوران اسے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے فوجیوں کے ہمراہ آکر ہمارا سامنا کر سکے۔ اس کی بزدلی نے دوسرے فوجیوں کو بھی بھاگنے پر مجبور کیا۔

اس حملے کے بعد اس بات کا قوی امکان تھا کہ فوج کل اس گاؤں کا دوبارہ کریک ڈاؤن کر کے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنائے گی۔ اسی متوقع حملے میں حصہ لینے والے فوجیوں کو مزید زچ کرنے کے لیے میرے ذہن نے جلدی سے ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ بستی کے سرکردہ افراد کے مشورے کے بعد میں نے سندھ ندی پر لکڑی کے معلق پل کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے عام لوگوں کو دو کلومیٹر دور جا کر ایک دوسرے پل کے ذریعے ندی کو عبور کرنا پڑتا مگر انہوں نے اس مشکل کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ پل کے نہ ہونے کی وجہ سے فوج کو بھی ایک لمبا چکر کاٹ کر

اس گاؤں میں داخل ہونا پڑتا۔ میں نے گاؤں کے نمبردار سے کہا..... بستی کے ہر گھر سے ایک ایک فرد کو لازمی اس کام میں شریک کیا جائے۔ رات دس بجے لوگ بڑے ذوق و شوق سے کلہاڑیاں اٹھائے پل پر پہنچ گئے تھے۔

میرے باقی ساتھی گاؤں میں جا کر سو گئے تھے اور میں پل توڑنے والوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آدھی رات تک لوگوں نے پل توڑ کر نالہ سندھ کی نذر کر دیا تھا۔ کام مکمل ہونے کے بعد میں نے لوگوں سے خطاب کیا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی اور نصیحت کرتے ہوئے کہا۔۔۔ پل توڑنے کا الزام ایک دوسرے پر عائد کرنے کے بجائے، براہ راست ہمیں اس کا ذمے دار قرار دیں۔

چند دن بعد مقامی افراد کا ایک وفد کمین گاہ میں ہمارے پاس آیا۔ دعا سلام کے بعد انہوں نے بتایا کہ فوجی افسروں نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کے پاس بھیجا ہے کہ دونوں فریق آپس میں ”جنگ بندی“ کا معاہدہ کر لیتے ہیں۔ میں نے وفد سے ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ ”اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ہم پاکستان سے محض سیر سپاٹے کے لیے یہاں آئے ہیں، اگر ہم صلح کے خواہش مند ہوتے تو پھر یہاں آتے ہی کیوں آپ ان سے جا کر کہہ دیں کہ اگر فوج کشمیر چھوڑنے پر آمادہ ہے تو ہم جنگ بندی کے لیے تیار ہیں، ورنہ حملے ہوتے رہیں گے۔“

اگلے روز ایک فوجی افسر نے وائرلیس کے ذریعے ”جنگ بندی“ کی درخواست کی جو میں نے بڑی حقارت سے ٹھکرا دی۔ چند روز بعد ایک میجر نے بالواسطہ رابطہ قائم کیا اور استدعا کی اگر ہم اس کے پانچ کلومیٹر کے علاقے میں کوئی کارروائی نہ کریں تو وہ ہمارے چند ایسے مطالبات پورے کرنے کے لیے تیار ہیں جو اس کے بس میں ہوں۔ میں نے ساتھیوں سے اس پیشکش کے بارے میں بات کی۔ صلاح و مشورے کے بعد ہم نے آزمائش کے طور پر اس سے کافی مقدار میں بارود

راؤنڈ ز اور گنتوں کا مطالبہ کیا۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ ہمارا مطالبہ پورا کرے گا، لیکن اس دوران یہ معاملہ کسی طرح فوج کی اعلیٰ کمان کے علم میں آگیا اور فوجی افسر کو گرفتار کر لیا گیا۔

کشمیر میں چاول پکانے اور کھانے کا عام رواج ہے۔ جب میں افغانستان کیمونسٹ حکومت کی قید میں تھا تو پل چرخی جیل میں قید کے دوران مجھے کھانے میں شیشہ پیس کر کھلایا جاتا رہا، جس کی وجہ سے میری انتڑیاں اور معدہ زخمی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق میں مرچیں اور چاول کھانے سے پرہیز کرتا تھا۔ کشمیر میں قیام کے دوران میری ماؤں اور بہنوں نے میری صحت کے پیش نظر ہمیشہ گندم کی روٹیاں پکا کر کھلانے میں خوشی محسوس کی۔ اب تو حالت یہ ہو گئی تھی کہ کنگن کے ہر گھر کی خاتون کو علم تھا کہ شاہین چاول اور مرچیں نہیں کھاتا اس لیے روٹیاں اور پرہیزی سالن تیار کیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک طرف ہم فوجیوں کے شکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے، تو دوسری طرف ماؤں اور بہنوں کی پر خلوص اور پر تکلف میزبانی کے مزے لے رہے تھے۔

ٹنگ چھتر کی تازہ کامیابی کے بعد خیال تھا کہ فوجی جوابی کارروائی کریں گے، لہذا اگلے روز فیصلہ ہوا کہ حفظ ماتقدم کے طور پر ساتھیوں کو مختلف علاقوں میں بھیج دیا جائے۔ ذوالفقار، زمر گل، سلیم اکبر، ذکی، عادل، عمر انقلابی، شہباز، سیف اللہ اور تنویر نے منی گام جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ منی گام کے پہاڑ پر ہم نے ایک بہت بڑی کمین گاہ ابتدائی دنوں میں بنالی تھی، جو اب ان ساتھیوں کے کام آرہی تھی۔ افغانستان کے ابوذر بھائی اور دیر کے عطا الرحمن بھائی نے میرے ساتھ گٹل باغ کے پشتو بولنے والے علاقے میں جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم سب ساتھی عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد اکھال، بخون اور پرنگ سے ہوتے ہوئے گٹل باغ پہنچے۔ وہاں

سیکشن کمانڈر مشتاق ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی کمین گاہ پر پہنچا دیا۔

اگلے دن ہم گٹل باغ کے پہاڑی ٹھکانے پر پہنچے۔ گٹل باغ کے اطراف میں ہری پورہ اور بابا وائل میں فوجی کیمپ ہیں۔ پہلے اس جگہ پولیس کا مرکزی دفتر تھا، لیکن اب اسے فوج نے قبضے میں لے کر کیمپ قائم کر لیا ہے۔ گاندر بل اور کنگن کے سنگم پر واقع اس مقام پر میں نے جب کیمپوں میں فوجیوں کو آزادی سے گھومتے پھرتے دیکھا تو حملے کا موڈ بن گیا۔ ابھی تک ان کیمپوں پر ہم توجہ نہیں دے سکے تھے، مگر دوسرے ساتھی حملے میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں تماشا دکھانے کے لیے وہیں بٹھا دیا اور خود ابوذر بھائی اور عطاء الرحمان بھائی کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔ ہمارے پاس پیکا گن کے علاوہ سنائپر بھی تھی۔ کیمپوں سے بالکل سامنے تین سو میٹر کے فاصلے پر ہم نے پوزیشنیں لے لیں۔ دن دس بجے کے قریب جب کیمپ میں خوب چہل پھل تھی میں نے پیکا سے چند کھڑے فوجیوں کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ دوسری طرف سنائپر بھی چلنے لگی۔ ہم تاک تاک کر ایک گھنٹے تک فائر کرتے رہے۔ جواب میں فوجی بھاری اسلحے سے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ کیمپ کی افرا تفری کو اوپر سے ساتھی دور بین کے ذریعے دیکھ رہے تھے۔ قریب ہی بی ایس ایف کا ایک کیمپ تھا۔ فوجی کیمپ پر حملے کی وجہ سے وہ سب کیمپ میں ہی دبک کر بیٹھ گئے۔ شاید وہ خوش تھے کہ حملہ ان پر نہیں ہوا۔ ساتھ ساتھ وہ فوجیوں کی درگت بننے پر بھی شادماں تھے۔ چند فوجیوں کو خون میں غسل دینے اور کچھ کمروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے توڑنے کے بعد ہم ساتھیوں کے پاس پہاڑ پر واپس لوٹ گئے۔

اگلے روز ایک گروپ منی گام سدھار گیا۔ گاندر بل کے کمپنی کمانڈر نے

ہماری ضروریات کے لیے پانچ سو راؤنڈ بھجوائے تھے۔ بڑی خوشی سے یہ سوغات وصول کرنے کے بعد میں پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ٹنگ چھتر کی طرف روانہ ہوا۔ ستمبر کا مہینہ تھا، کشمیر کا موسم صاف لیکن خنک تھا۔ مغرب کی اذان کے بعد ہم ایک چھوٹی سی بستی کے اوپر جنگل میں پہنچے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا تھا اور آگے سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ میں نے ساتھیوں کی مدد سے ٹینٹ نصب کیا، خشک فروٹ اور باسی روٹیاں کھائیں اور نماز پڑھ کر لیٹ گیا۔

جب آنکھ کھلی تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ "دفعتا" ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی، کوئی درخت کاٹ رہا تھا، میں یہ آواز سن کر چونک گیا۔ ٹارچ لے کر آواز کی جانب چل پڑا۔ کنگن میں جنگل کی کٹائی پر ہم نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ جنگل نے جس طرح ہمیں پناہ دی تھی اور متعدد بار فوجیوں سے بچانے کے لیے ہمیں آغوش محبت میں لیا تھا، اس کے بعد ضروری تھا کہ ہم جنگل کی کٹائی نہ ہونے دیں۔ ہم نے اس مقصد کے لیے مختلف بستیوں کے بزرگوں پر مشتمل کمیٹیاں قائم کر رکھی تھیں جو مستحق افراد کے لیے لکڑی کاٹنے کی سفارش کرتی تھیں۔ ہماری کوشش تھی کہ ضرورت مند کو لکڑی ملے لیکن چور جنگل کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ قریب ہی ایک پہاڑی نالہ تھا۔ چور اکثر لکڑی کاٹ کر اس نالے میں بہا دیتے اور گٹل باغ کے قریب سندھ ندی میں پکڑ کر اسے ٹرکوں میں لاد کر سری نگر لے جا کر فروخت کر دیتے تھے۔

میں نے دیکھا، ایک بوڑھا شخص درخت کاٹ رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اونچی گھاس میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد مجھے دوبارہ درخت کاٹنے کی آواز سنائی دی، میں آہستہ آہستہ وہاں پہنچا تو اب کے ایک نوجوان لڑکا درخت کاٹ رہا تھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور

لے کر خیمے کی طرف چل دیا۔ میں آگے چل رہا تھا اور وہ پیچھے۔ اچانک میں نے
 پیچھے مڑ کر دیکھا، تو وہ درختوں میں غائب ہو رہا تھا۔ میں نے وہیں سے اسے ڈرانے
 کے لیے ایک ہوائی فائر کر دیا، تاہم وہ درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا۔ عین اس
 وقت نیچے گاؤں میں فوج آئی ہوئی تھی۔ گولی کی آواز سن کر فوج ہوشیار ہو گئی، لیکن
 اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ گولی کس سمت سے چلی ہے۔ فوجی اندازہ لگا کر ہم سے
 مخالف سمت کی طرف چل دیے اور چند سو میٹر کے فاصلے پر انہوں نے ایک اونچی
 ٹیکری پر پوزیشنیں لے لیں۔ اتنے میں دیگر ساتھی بھی بیدار ہو کر میرے پاس پہنچ
 چکے تھے۔ ہم درختوں کی اوٹ میں مشورہ کر رہے تھے کہ کیا کیا جائے کہ چند افراد
 کلہاڑے اٹھائے آتے دکھائی دیے۔ ہم چھپ کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ اپنی
 دھن میں لگن جیسے ہی وہ ہمارے قریب سے گزرے میں نے انہیں روک لیا۔
 انہوں نے آہ و زاری شروع کر دی، لیکن میں نے ان کی ایک نہ مانی اور انہیں لے
 کر محفوظ مقام پر پہنچ گیا۔ لکڑی کاٹنے والوں سے میں نے بغیر اجازت لکڑی کاٹنے پر
 باز پرس کی تو ان میں سے ایک نوجوان نے بتایا اس کی شادی ہونے والی ہے۔ یہ
 لکڑیاں شادی کے موقع پر کام آئیں گی۔ میں نے کہا، اس کا استحقاق تو بنتا ہے
 لیکن اس کے لیے اجازت ضروری ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ فوجیوں نے بھی
 انہیں حکم دے رکھا ہے کہ ہر شخص واپس آتے ہوئے نو، نو فٹ کا ایک شہتیر
 ان کے لیے ضرور لائے۔ فوجیوں نے قریب ہی ایک نیا کیمپ قائم کیا تھا جس کی
 الماریوں اور کھڑکیوں اور دروازوں کے لیے لکڑی طلب کر رہے تھے۔ میں نے
 انہیں سمجھایا کہ جنگل کے بڑے بڑے درخت تو پہلے ہی کاٹ لیے گئے ہیں، چھوٹے
 درختوں کو بڑے ہونے دیں جو مجاہدین کو محفوظ پناہ گاہ فراہم کرتے ہیں۔
 ہم جانتے تھے کہ فوجی ہمارا تعاقب ضرور کریں گے۔ اس لیے اس جگہ کو

چھوڑنا ضروری تھا۔ کچھ دیر بعد ساتھیوں نے خیمہ اکھاڑ لیا اور ہم جنگل میں اوپر چڑھنے لگے۔ ایک جگہ سے میں نے نیچے جھانکا تو مجھ سے دو سو میٹر کے فاصلے پر چند فوجی اوپر چڑھتے دکھائی دیے۔ ان سے باقاعدہ جنگ چھیڑنا تو مناسب نہ تھا، پھر بھی میں نے ساتھیوں کو اخروٹ کے ایک بڑے درخت کے پیچھے رکنے کو کہا، خود میں نے با آواز بلند فوجیوں کو للکارا۔۔۔ ”اوائے بھارتی فوجیو۔۔۔! رک جاؤ۔۔۔ ورنہ بھیجاڑا دوں گا۔“ فوجیوں نے آواز سنتے ہی ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔۔۔ میں نے پھر با آواز بلند کہا: ”یہ ایک دائیں جانب نظر آرہا ہے“ اسے گھیرے میں لے لو۔۔۔“ دوسری طرف سے طاہر سلیم کی آواز سنائی دی۔۔۔ ”ہاں کمانڈر صاحب میں اسی کے پیچھے جا رہا ہوں۔“ فوجی ہماری چال میں آگئے اور بڑی تیزی سے قریبی نالے سے ہو کر گاؤں کی طرف دوڑنے لگے۔ دو فوجی گھاس میں چھپنے کی کوشش کرتے دکھائی دیے تو میں نے ان سے کہا۔۔۔ فوراً بھاگ جاؤ ورنہ مار مار کر بھس بنا دوں گا، دونوں فوجی درختوں کی آڑ میں ہاتھ اٹھائے، سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ کافی دیر تک ہم فوجیوں کے اعصاب سے کھیلنے کا لطف اٹھاتے رہے۔

کچھ دیر بعد کنگن کے ریئر ہیڈ کوارٹر سے فوج کی بھاری کمک آتی دکھائی دی۔ ساتھی کافی اوپر پہنچ گئے تھے۔ میں بھی تیزی سے چلتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ اب ہماری منزل ہماری پرانی کمین گاہ تھی۔ فوج نے حسب معمول وسیع پیمانے پر کریک ڈاؤن کر کے ہماری تلاش شروع کر دی تھی، لیکن ہم نے ملنا تھا نہ ملے۔ فوج تیسرے پہر واپس چلی گئی۔ اگلے دن میں بخون چلا گیا۔ وہاں مجھے اطلاع ملی کہ پاکستان سے دو ساتھی میرے پاس آنے کے لیے پرنگ پہنچ چکے ہیں۔ اسی روز شام کے وقت میں نے پرنگ کے قریب باغ کے اخلاق بھائی اور خانیوال کے نسیم صابر

بھائی کو خوش آمدید کہا اور نئے ساتھیوں کو لے کر واپس بخون پہنچا۔ وہ رات ہم نے کنگن کے فوجی کیمپ کے بالکل سامنے ایک بڑے پتھر پر آگ کا ایک بڑا الاؤ جلا کر اس کے گرد سو اور جاگ کر گزار دی۔ فوجی رات بھر اپنے کیمپ سے ہمیں دیکھتے رہے، لیکن ہمیں چھیڑنے سے باز رہے۔ عرفان بھائی بخون میں مقامی مجاہدین کے پاس رک گئے تھے جب کہ میں اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ٹنگ چھتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہمارے چھوٹے سے گروپ کے پاس تین پیکا گنیں، ایک سنائپر گن اور دو کلاشن کوفوں کے علاوہ ہزاروں راؤنڈ تھے۔ نئے ساتھی اپنے ہمراہ خاصی مقدار میں اسلحہ اور ایمونیشن بھی لے کر آئے تھے۔ اب ہمارے پاس فوج کے لیے خاصی ”خوراک“ موجود تھی۔

چند دن نئے ساتھیوں کی ”میزبانی“ میں گزر گئے۔ ایک روز علی الصبح نماز کے لیے بیدار ہوئے تو نیچے دیکھا فوجی غول در غول پھر رہے ہیں۔ نسیم بھائی اور اخلاق بھائی نے ان کو نشانہ بنانے کے لیے پیکا اٹھالی، لیکن میں نے ہنستے ہوئے کہا، ابھی انتظار کریں۔ انہوں نے گن تو چھوڑ دی، لیکن میری ”دخل در معقولات“ پر خوش نہیں تھے۔ دن دس بجے فوج کریک ڈاؤن اٹھا کر کیمپوں کی طرف جانے لگی تو میں نے سنائپر اٹھائی اور دیگر ساتھیوں کو ساتھ بٹھا کر بھیڑیوں کے اس غول پر نشانہ بازی کرنی شروع کی۔ سب سے پہلے میں نے ایک فوجی صوبیدار کا نشانہ لے کر اسے ڈھیر کر دیا۔ اس کے بعد باری باری سب ساتھیوں سے ایک ایک فائر کرایا۔ خوش قسمتی سے بھاگتے دوڑتے فوجیوں پر سب فائر نشانے پر لگے۔ میں دور بین کے ذریعے ساتھیوں کی کارکردگی دیکھتا اور ساتھ ساتھ نتائج سے انہیں آگاہ کرتا رہا۔ ہم نے چھ فائر کیے تھے۔ ان سے تین فوجی ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔

دوپہر کا وقت تھا، ہم بھوک سے نڈھال ہو گئے تھے۔ جس کے پاس جو کچھ

کھانے کے لیے تھا اس نے نکال کر ”دستر خوان“ پر رکھ دیا۔ ہم نے اس سے کسی قدر پیٹ کی آگ بجھائی۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد نیچے نظر پڑی تو دیکھا ہزاروں کی تعداد میں فوج دوبارہ گاؤں میں آچکی ہے۔ ہم خاموشی سے اس کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے۔ فوج کے ساتھ بوسو نگھنے والے کتے بھی تھے۔ چند دن قبل ہم گاؤں سے ایک سفید بوری روٹیوں سے بھر کر لائے تھے تاکہ اگر کئی دن تک جنگل میں محبوس ہونا پڑے تو ہماری کھانے کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ لیکن ہمیں اس دوران گٹل باغ جانا پڑ گیا۔ بوری ہم نے گاؤں کے ساتھ جنگل میں ایک درخت کے تنے سے لٹکادی تھی۔ اس کے ساتھ گینتی بیلچہ اور چائے کی ایک کیتلی بھی پڑی رہ گئی۔ واپسی پر اسے اٹھانے کا ہمیں خیال نہ رہا اور روٹیاں وہیں پڑی سوکھتی رہیں۔ اب جو فوجی کتوں نے بوری کو دیکھا تو بھاگتے ہوئے اس کے پاس پہنچ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ فوجیوں نے تصور کر لیا کہ یقیناً کوئی مجاہد درخت کے ساتھ کھڑا ہے۔ انہوں نے جلدی سے پوزیشنیں لے لیں، ایک فوجی میگا فون پر چلانے لگا۔ ”ہینڈز اپ“۔۔۔ ہتھیار پھینک دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو۔“ ہم دو سو میٹر اوپر ایک چٹان کے اندر مورچے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ابتداء میں ”ہینڈز اپ“ کی آواز سن کر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی ہوئی کہ ہمارا کوئی ساتھی نہ پھنس گیا ہو، لیکن گنتی کی تو سب ساتھی موجود تھے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔ فوجی زمین پر لیٹے ہوئے اسی سفید بوری کو ”ہینڈز اپ“ کر رہے تھے۔ لیکن بوری بڑی ”اڑیل“ تھی، اور ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ نیچے فوج نے بٹ پورہ، ٹینگ اور ٹنگ چھتر کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ وہ سب جنگل کی مہم پر گئے فوجیوں کی طرف سے کسی ”خبر“ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

جب فوجیوں نے دیکھا کہ ”اگر وادی“ ان کی للکار پر بھی خاموش کھڑا ہے تو وہ کرائنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ قریب جا کر دیکھا تو شرمندہ ہوئے، لیکن تھے بڑے ڈھیٹ۔ دوسرے ساتھیوں کو اپنی ”کارکردگی“ دکھانے کی خاطر بڑے فخر سے بوری اٹھائی اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے یہ سارا ڈرامہ دور بین کے ذریعے دیکھا۔ فوج نے اس ذلت کا انتقام گاؤں کے بے گناہ افراد سے لیا۔ انہیں سندھ ندی کے ٹھنڈے پانی میں غوطے دیے اور بری طرح زدوکوب کیا۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ ظالموں سے بے گناہوں کے بدلے چن چن کر لوں گا۔

نہتے لوگوں پر فوج کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ ہمیں برابر خبریں ملتی رہتی تھیں کہ مجاہدین کے حملوں کا بدلہ بے گناہ لوگوں سے لیا جاتا ہے۔ گاؤں کے بچے جنگل میں ہمارے پاس باقاعدگی سے ساری رپورٹیں لاتے تھے۔ فوجی گاؤں کے لوگوں سے جو گفتگو کرتے خبر رساں بچے حرف بحرف ہمیں سنا دیتے۔ پتہ چلا کہ ان ہی دنوں ایک گاؤں کے نمبردار غلام حسن کو فوجی پکڑ کر غنڈ فوجی کیمپ میں لے گئے، جہاں ہماری حمایت کے الزام میں ایک فوجی کرنل کی نگرانی میں تین روز تک اس پر بے پناہ تشدد کیا جاتا رہا۔ چوتھے روز آدھی رات کے وقت اسے نیم مردہ حالت میں گاؤں میں لا کر پھینک دیا گیا۔ علی الصبح گاؤں کے لوگ اسے اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ ہسپتال میں افاقہ نہ ہوا تو اسے گھر منتقل کر دیا گیا۔ ہم اس کی تیمارداری کے لیے گئے تو دیکھا۔۔۔ اس کی قوت گویائی ختم ہو چکی ہے۔ وہ بے بسی سے ہمیں ٹٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ تین دن تک ہم اسے دیکھنے جاتے رہے۔ ایک ماہ بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو بیوی بچے اسے ساتھ لے کر سری نگر ہجرت کر گئے۔ غلام حسن نمبردار کے اغوا اور اس پر تشدد کی رپورٹ مقامی تھانے میں درج کرائی گئی لیکن یہ محض رسمی کارروائی تھی۔ پولیس کے بس میں نہیں تھا کہ فوج کے

دست ظلم کو روک سکے۔

اسی طرح ٹنگ چھتر کے غلام قادر شاہ اور اس کے بیٹے فیاض احمد کو ایک رات فوجیوں نے اٹھالیا اور نالہ سندھ کے کنارے لے جا کر بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا اور رات گئے گھر کے باہر پھینک گئے۔ فوج نے اس جرم سے دامن بچانے کے لیے اگلے دن ایک فوجی ڈاکٹر کو اس کے علاج معالجے کے لیے بھیج دیا۔ فوج نے اس کے گھر میں آٹا اور چینی بھی بھجوائی تاہم انہوں نے راشن وغیرہ واپس بھیج دیا۔ میں بھی اس کی عیادت کے لیے گیا اور چند ہزار روپے مالی امداد کے طور پر پیش کیے۔

میں یہاں پر کنگن کی خواتین کی بہادری اور دلیری کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کئی بار خواتین نے فوج سے آمنے سامنے لڑائی لڑی۔ مثلاً ایک دن کچھ فوجیوں نے ایک خاتون کو چھیڑا تو اس کی پکار پر وہاں کئی خواتین جمع ہو گئیں۔ انہوں نے کانگریس، پتھروں اور ڈنڈوں سے فوجیوں پر حملہ کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ان خواتین نے کئی بار اپنے مجاہد بھائیوں کی امداد بھی کی۔

ایک دن میں اخلاق بھائی کے ساتھ گٹل باغ گیا تو معلوم ہوا ذوالفقار، سلیم اکبر اور زمر دگل پاکستان واپس چلے گئے ہیں۔ راشد بھائی کو بھی میں نے پاکستان جانے کی اجازت دے دی تھی، وہ کنگن سے لولاب پنچے اور کمانڈر شیر خان کے ہمراہ چند کارروائیوں میں شرکت کی۔ عبدالرحمان بھائی نے ساٹھ ستر نئے مجاہدوں کو لانچ کیا اور خود بھی ان کے ہمراہ پاکستان روانہ ہو گئے تھے۔ طاہر اسحاق بھائی بھی واپس لوٹ گئے تھے۔ اس طرح ہم بہت تھوڑے سے پاکستانی ساتھی رہ گئے جن میں سے کچھ گاندربل چلے گئے تھے۔ ساتھیوں کی واپسی کی خبر نے خاصا افسردہ کر دیا۔ تاہم میں نے باقی ساتھیوں کے ہمراہ اپنا کام جاری رکھنے کا عزم کر لیا۔ ہمارے چند ساتھی تو

منی گام اور بخون میں رہ گئے اور میں تین چار مجاہدوں کے ہمراہ ٹنگ چھتر لوٹ آیا۔
 ٹنگ چھتر، بٹ پورہ اور ٹینگ کے بہت سے لوگ بھارتی فوج کے مظالم کی
 وجہ سے ہجرت کر چکے تھے۔ باقی لوگ رات کے وقت کسی ایک گاؤں میں اکٹھے ہو
 کر رہتے تھے۔ مغرب کے بعد جب ہم نیچے گاؤں میں کھانا وغیرہ لینے جاتے
 تو اکثر بستیوں میں الو بول رہے ہوتے۔ ہمارے پاس رقم ختم ہو رہی تھی اور مزید رقم
 کا حصول بھی مشکل تھا۔ ہمارے چند ہمدرد ہمارے کھانے پینے کا بندوبست نہ کرتے
 تو فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ فوج نے دباؤ بہت بڑھا دیا تھا، مگر ہمیں خورد و نوش کا مسئلہ
 حل کرنے کے لیے بستیوں میں جانا ہی پڑتا تھا۔ دن کے وقت ہم ان گھر والوں کو بتا
 دیتے کہ ہمارے لیے کھانا تیار کر لیں۔ عصر کے وقت کھانا تیار کر کے ہمارے یہ
 دوست خود دوسرے گاؤں میں چلے جاتے اور جاتے ہوئے گھر کا ایک آدھ دروازہ یا
 کھڑکی کھلی چھوڑ دیتے تھے۔ رات کے وقت ہم نیچے اترتے تو جس گھر کی کھڑکی کھلی
 دیکھتے اس میں چپکے سے داخل ہو کر کھانا گرم کر کے کھا لیتے تھے۔ اس کے بعد ہم
 دوبارہ چھپتے چھپاتے جنگل میں اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے۔ واپسی پر ہم مختلف
 کیمپوں سے گزرتے ہوئے بلند آواز میں چند نعرے بلند کرتے جاتے۔ اس سے
 کیمپوں اور گھات پر موجود فوجیوں پر رات بھر لرزہ طاری رہتا کہ مجاہدین حملہ
 کرنے والے ہیں۔ یہی عمل کچھ دیر بعد دوسرے گاؤں کے عقب میں جا کر دہرایا
 جاتا۔ فوج اور ہندوستان کے خلاف لگائے گئے نعرے رات بھر فوجیوں کو سونے نہ
 دیتے تھے۔ آخر شب دوبارہ جنگل میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر نماز فجر ادا کرتے اور پھر
 ایسے بے خبر ہو کر سوتے کہ کہیں جا کر ظہر کی نماز کے لیے بیدار ہوتے۔
 اس اثنا میں گٹل باغ سے اخلاق بھائی اور نسیم بھائی بھی ہمارے پاس آ گئے۔
 ٹنگ چھتر میں دس دن تک ہمارے یہی معمولات رہے۔ اس کے بعد ہم قریبی بستی

ہاں چلے گئے۔ وہاں بھی دن کے وقت فوج کی غیر معمولی نقل و حرکت رہتی تھی۔
رات کو دکانداروں کو جگا کر ان سے ہم اپنی ضرورت کا راشن خریدتے۔ لوگ بھی
مہمان نواز تھے، خطرات کے باوجود ہمارے لیے کھانا تیار کر دیتے تھے۔

وہاں چند دن رہنے کے بعد ہم سترانہ واپس آ گئے۔ ایک رات میں نے
ساتھیوں سے کہا کافی دن ہو گئے ہیں کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس پر ساتھیوں نے
مجھے ”مورد الزام“ ٹھہرایا اور کہا آپ کی سستی کی وجہ سے ہم اتنے دن سے کوئی
کارروائی نہیں کر سکے۔ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”تو پھر ہو جائے
چھوٹی موٹی کارروائی۔۔۔۔۔؟“ اس پر سب نے یک زبان ہو کر کہا۔۔۔۔۔ ”بالکل“۔

اس روز آدھی رات کے وقت، جب ہر طرف سناٹا طاری تھا، میں اپنے
ساتھیوں کے ہمراہ جنگل کے دامن میں ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا
چل رہا تھا۔ گاؤں کے بچوں نے چند دن قبل مجھے بتایا تھا کہ اس راستے پر فوجی دن
بھر پہرہ دیتے ہیں۔ اگلے دن میں نے چند بچوں کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ خاموشی سے
وہاں جائیں اور فوجی گن کر آئیں اور یہ بھی دیکھیں کہ ان کے معمولات کیا ہیں۔
اگلے دن بچوں نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ ڈیڑھ کلومیٹر راستے پر پچیس فوجی
پوزیشنیں لے کر پہرے پر بیٹھتے ہیں، جب کہ پچیس فوجیوں کا ایک گروپ ڈیڑھ
کلومیٹر کے اس حصے میں گشت کرتا رہتا ہے اور ان کے درمیان کم از کم پانچ میٹر کا
فاصلہ ہوتا ہے۔ میں نے ساتھیوں کو یہ معلومات دیں۔۔۔۔۔ اور اب ہم ان ہی
معلومات کی روشنی میں کارروائی کے لیے جنگل کے دامن میں پہنچے تھے۔ باہمی
مشورے سے طے پایا دو دو سو میٹر کے فاصلے پر پانچ گڑھے کھود کر بارود کی سرنگیں
لگائی جائیں، اور گشت کے وقت فوجیوں کو نشانہ بنایا جائے۔ کئی گھنٹے کی محنت شاقہ
کے بعد ہم نے گڑھے مکمل کیے۔ ہر گڑھے میں دو دو کلوا بارود ڈال کر پانچوں بارودی

سرنگوں کو ایک تار کے ذریعے آپس میں ملا دیا اور تار کو جنگل میں جھاڑیوں میں لے جا کر چھپا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سارے کام کا ٹارچ کی مدد سے بغور معائنہ کیا۔ ان تمام نشانات کو بہت احتیاط سے مٹا دیا جن پر فوجیوں کو شک ہو سکتا تھا۔ فجر کی اذانوں کے ساتھ ہم اپنی گئیں اور گینتی نیچے اٹھائے جنگل میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ باقی سب ساتھی سو گئے اور میں سورج کے اونچا ہونے تک منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کرنے کے لیے منتظر رہا۔ اس کے بعد درختوں کے پتوں سے اپنے آپ کو کیمو فلاج کیا اور چھپتے چھپاتے اس مقام پر پہنچا جہاں مجھے بیٹری کے ذریعے تار کو ٹیچ دینا تھا۔ فوجی تھکے ہارے قدموں سے پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ مجھ سے ان کا فاصلہ دو سو میٹر کے قریب تھا۔ ہر ایک نے گن تھامی ہوئی تھی۔ میں ان کے ریج میں آنے کا منتظر تھا۔ پھر اللہ کا نام لے کر جیسے ہی بیٹری کو تار سے جوڑا، آنا، فنا، پانچ دھماکے ہوئے۔ مجھے بالکل سامنے ایک فوجی کئی فٹ ہوا میں اچھلتا ہوا نظر آیا۔ اس کے بعد میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ میں اٹھا اور قبل اس کے فوجی فائرنگ کا سلسلہ شروع کرتے، تیزی سے اوپر چڑھ کر ایک محفوظ اوٹ میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد فوجیوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی، مگر اب وہ میرے گرد کو بھی نہ پاسکتے تھے۔ پندرہ منٹ بعد میں ساتھیوں کے پاس پہنچا تو وہ بھی فائرنگ کی آوازیں سن کر جاگ اٹھے تھے۔

دن بھر خوف زدہ فوجیوں نے فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ شام کو وہ واپس چلے گئے تو میں ساتھیوں کے ہمراہ نیچے گاؤں میں پہنچا۔ گاؤں کے درجن بھر بچے بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے بڑے جوش و خروش سے تازہ رپورٹ پیش کرنی شروع کر دی۔ سارے بچے اکٹھے بولنے لگے تو میں نے کہا۔۔۔ ”بھائی باری باری بات کرو۔“ ان کی زبانی پتہ چلا آج کی کارروائی میں دو

فوجی ہلاک اور تین زخمی ہوئے ہیں۔ مجھے اتنے ہی جانی نقصان کی توقع تھی کیوں کہ فوجیوں کا درمیانی فاصلہ زیادہ تھا۔

اگلے دن ہم پیچھامہ چلے گئے۔ فوج کی نقل و حرکت اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ ہمارے لیے دن کی روشنی میں کسی گاؤں میں اترنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس بستی کے اوپر جنگل میں دو دن قیام کیا، پھر حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ ٹنگ چھتر روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو بخون سے عطاء الرحمان بھائی نے وائرلیس سیٹ پر بتایا کہ میں بھی آپ کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ اگلے دن وہ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ رات گزارنے کے بعد جب ہم بیدار ہوئے تو نیچے گاؤں فوجیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم اپنی کمین گاہ سے ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگے۔ اس روز انہوں نے گاؤں کے بے گناہ اور معصوم لوگوں کو بدترین تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ نالہ سندھ کے کنارے وہ دن بھر گاؤں کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو زد و کوب کرتے رہے۔ عصر کے وقت فوج کی واپسی شروع ہو گئی، وہ نالہ سندھ کے پل کو عبور کر کے سامنے کے کیمپوں میں جا رہے تھے۔ ہم ان کی گنتی کرتے رہے۔ آٹھ سو فوجی واپس چلے گئے اور اس کے بعد واپسی کا سلسلہ رک گیا تو ہم نے سمجھ لیا کہ ساری فوج واپس چلی گئی ہے، حالانکہ ایسا نہ تھا۔ مغرب سے کچھ پہلے میں ساتھیوں کو لے کر نیچے اتر، میں چاہتا تھا کہ گاؤں کے افراد سے ان کی خیریت وغیرہ دریافت کر لوں۔

جنگل کے دامن میں پہنچے تو میں اپنی پیکا اٹھائے ہوئے سب سے آگے تھا۔ مجھے سے پچاس میٹر پیچھے اخلاق بھائی تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر طاہر سلیم، عطاء الرحمان، نسیم صابر اور ابن سیفل آ رہے تھے۔ اپنی دھن میں مست میں آگے بڑھتا ہوا، جنگل کے دامن میں واقع اس گراؤنڈ میں پہنچا جہاں اس سے قبل بھی فوج سے کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ اچانک میری نگاہ گراؤنڈ کے سرے پر ایک دس گز لمبی

اور دو فٹ اونچی دیوار پر پڑی۔ دیوار کے سوراخوں میں سے بندوق کی نالیاں حرکت کرتی دکھائی دیں، یہ صرف غور کرنے سے ہی نظر آ سکتی تھیں۔ شاید میری چھٹی حس اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت نے ایک لمحے کے اندر اندر مجھے بتا دیا کہ فوجی اس دیوار کے پیچھے لیٹے ہوئے میرے قریب آنے کے منتظر ہیں۔ انہوں نے دیوار سے پتھر نکال کر کئی جگہوں میں فائرنگ کے لیے جگہیں بنا رکھی تھیں۔ میں اس وقت کھلے میدان میں تھا۔ دشمن سے میرا فاصلہ سو میٹر سے بھی کم تھا۔ صورت حال پر دشمن کا مکمل کنٹرول تھا، مگر میں نے ہوش و حواس کو پوری طرح قابو میں رکھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کی صورت میں پیچھے آنے والے میرے ساتھی بھی ان کی رینج میں آ سکتے تھے۔ دیوار سے میرا فاصلہ محض پندرہ میٹر تھا۔ میں نے فی الفور ایکشن کا فیصلہ کیا۔ بغیر کسی تاخیر کے پیکا کندھے سے اتاری، اس کا سٹینڈ اتار کر نیچے پھینکا، میری نظریں بدستور دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے میں نے دیوار پر لاتعداد فائر جھونک دیے۔ اس کے ساتھ ہی فوجیوں کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ دیوار کے عقب سے ان کے پانی کی نالی میں گرنے اور بھاگنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ حیران کن بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھ پر ابھی تک ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔ میری فائرنگ سے دیوار ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ دشمن کے فوجی اپنی بزدلی کی وجہ سے سوچتے رہ گئے اور میں اعصاب کو قابو میں رکھنے کی وجہ سے ان پر بازی لے گیا۔

دراصل ہمیں تین اطراف سے فوج نے گھیرا ہوا تھا، میری فائرنگ کے ساتھ ہی چاروں طرف گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں کھلے میدان میں کھڑا تھا اور میرے چاروں طرف فائرنگ ہو رہی تھی۔ میرے پیچھے آنے والے ساتھی بھی چوکنے ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی پوزیشن لے کر دشمن پر فائرنگ

شروع کر دی تھی۔ میں نے ایک جانب بھاگ کر پناہ گاہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ بھاگتے ہوئے بھی میں نے پیکا سے فائرنگ جاری رکھی۔ میں اتنا غیر محفوظ پورے جہادی عرصے میں کبھی نہ ہوا تھا، ہر لمحے مجھے انتظار تھا کب کوئی گولی میرے سینے میں آکر لگے گی اور میں شہید ہو جاؤں گا۔ چند گولیاں میری شلوار کے پائنتوں میں سوراخ کر گئی تھیں اور کپڑوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، لیکن اللہ نے مجھے محفوظ رکھا ہوا تھا، مجھے خراش تک نہیں آئی تھی۔ چند لمحے بعد میں بھاگتا ہوا اور اللہ کے پاک نام کا ورد کرتا ہوا گراؤنڈ کے کنارے ایک درخت کی آڑ میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا وہاں پہنچتے ہی میری پیکا بند ہو گئی۔ کافی کوشش کے باوجود بھی جب پیکا ”راضی“ نہ ہوئی تو میں نے اسے کندھے پر رکھا اور پستول نکال کر دشمن پر اکادکا فائر کرنے لگا۔

عطا الرحمان بھائی سب سے پیچھے تھے۔ انہوں نے جھڑپ ہوتے دیکھی تو وہ نسیم صابر کو ساتھ لے کر ایک چکر کاٹ کر میدان کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک درخت کی آڑ لے کر اپنی کلاشنکوف سے فوجیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ درخت سے اچانک باہر نکلتے اور چند فائر داغ کر درخت کی اوٹ میں چلے جاتے، انہیں معلوم نہ تھا کہ چاروں طرف گھات لگی ہوئی ہے۔ اتنے میں ایک ایل ایم جی والے فوجی نے انہیں دیکھ لیا، جوں ہی وہ کلاشنکوف لے کر باہر نکلے، اس نے ان پر برسٹ مارا اور وہ وہیں پر گر گئے۔ اس کے بعد درجنوں گولیاں عطا الرحمان بھائی کے جسم پر لگیں، میں بے بسی سے انہیں گرتے اور شہید ہوتے دیکھ رہا تھا۔ چند بار میرے قدم ان کی طرف اٹھے لیکن گولیوں کی بارش نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ عطا الرحمان بھائی کی شہادت کے فوراً بعد میں درختوں کی آڑ لے کر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ کوئی پانچ سو میٹر دور

ساتھیوں سے ملاقات ہوئی، میں نے ان سے عطا الرحمن بھائی کی شہادت کا ذکر کیا۔ ابن سیفل کو اپنی پیکا دے کر میں نے ان سے کلاشن کوف لے لی اور سب ساتھیوں کو فوراً اپنی کمین گاہ کی طرف جانے کا حکم دیا۔ ہماری کمین گاہ خاصی اونچی جگہ پر تھی۔ میں نے ان کو ہدایت کی کہ وہاں سے سناپنگ گن کے ذریعے فوجیوں کو نشانہ بنائیں۔ میں خود کلاشن کوف لے کر دوبارہ گراؤنڈ کی طرف بڑھنے لگا جہاں نسیم صابر محاصرے میں پھنسے ہوئے تھے۔ فوج کی فائرنگ شدت سے جاری تھی اور اندھیرے میں کسی طرف سے بھی کوئی گولی آکر پیغام شہادت دے سکتی تھی، لیکن محاصرے میں پھنسے ہوئے ساتھی کو نکالنا بھی ضروری تھا۔

میدان کے کنارے پر ایک درخت کی آڑ سے دیکھا تو سامنے نسیم بھائی تھے، خوش قسمتی سے انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ایک طرف سے نکلنے کو کہا۔ میری نظراہل ایم جی والے فوجی پر تھی۔ وہ نظر تو نہیں آ رہا تھا، لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ کہاں پوزیشن لیے ہوئے ہے۔ میں نے اس کی طرف چند فائر کیے اور پھر نسیم بھائی کو نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی نکلنے کا موقع تلاش کر رہے تھے، انہوں نے میری آمد کو غنیمت جان کر درختوں کی آڑ سے میری طرف بڑھنا شروع کر دیا، لیکن یہ کام خاصا دشوار تھا، کوئی پندرہ منٹ وہ ریٹکتے ہوئے میری طرف بڑھتے رہے۔ اس دوران فوجیوں کی تازہ کمک آ پہنچی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا اور اور روشنی کے سینکڑوں گولے فضا میں اڑ رہے تھے۔ جنگل میں منگل کا نظارہ تھا۔ میں نسیم بھائی کو ساتھ لے کر واپس دو سرے ساتھیوں کی طرف روانہ ہوا۔ عطا الرحمن بھائی کا لاشہ ہم سے سو میٹر کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے نم آلود آنکھوں سے اسے دیکھا اور ساتھیوں کی طرف روانہ ہو گیا۔ چاند کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ میں نے وائرلیس سیٹ آن کیا اور قریبی گاؤں پنزن میں

شکیل بھائی سے کہا کہ فوراً جتنے بھی مجاہدین ہیں انہیں لے کر لداخ ہائی وے پر فوجی کیمپوں کے قریب گھات لگالیں، شکار آ رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے دوسری بستی میں سیکشن کمانڈر سے بات کی اور انہیں بھی گھات لگانے کے لیے کہا۔ ان کے پاس راکٹ لانچر بھی تھے۔ فوج کے متعلق میرا قیاس یہ تھا کہ یا تو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے آئی ہے یا پھر سامنے کے ایک دوسرے کیمپ سے آئی ہے۔ میں نے ان دونوں طرف سے آنے والے فوجی دستوں کے راستے پر مجاہدین کو گھات لگانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اپنی کمین گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ چاندنی میں نیچے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ فوجی دیر تک میدان میں ”ڈٹے“ رہے۔ رات بارہ بجے انہیں یقین ہوا کہ ہم چلے گئے ہیں تو اس کے بعد اپنی لاشیں گاڑیوں میں لوڈ کر کے روانہ ہوئے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ راستے میں ایک دوسری بلا ان کی منتظر ہے۔ شکیل بھائی کا گروپ بڑی بے چینی سے ان کا منتظر تھا۔ رات ایک بجے ایک دفعہ پھر سارا علاقہ گولیوں اور گولوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ یہ جنگ ہم سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہو رہی تھی۔ ہمارے ساتھیوں نے گرینیڈ تھرور، ایل ایم جی اور کلاشن کوفوں سے فوجی گاڑیوں پر تابڑ توڑ حملے کیے۔ یہ فوجی جو پہلے ہی بہت سے ساتھیوں کے مارے جانے کی وجہ سے خوف زدہ تھے، نئی آفت کا مقابلہ کرنے کے بجائے گاڑیوں سے اتر کر ارد گرد مختلف جگہوں میں چھپ گئے۔ صبح ہونے تک انہوں نے ہلنے جلنے کی کوشش نہیں کی۔ شکیل بھائی اور ان کے دوسرے ساتھی پندرہ منٹ میں اپنی کارروائی مکمل کر کے اسی جانب کے پہاڑ پر چلے گئے۔ میرا ان سے وائرلیس سیٹ پر رابطہ قائم تھا۔ وہ مجھے حملے کی تفصیلات سے آگاہ کرتے رہے۔ اس دوران مجھے اپنے سیٹ پر کچھ دوسری آوازیں بھی سنائی دیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا

فوج نے ہماری فریکوئنسی پکڑ لی ہے۔ میں نے فوراً سیٹ پر اپنے ساتھی سے کہا۔۔۔ فلاں جگہ بارودی سرنگ بچھا رکھی ہے، اسے رات کو ہی بلاسٹ کرنا ہے۔ اس طرح میں نے تین چار مقامات پر بارودی سرنگوں کی تنصیب کا ذکر کیا۔ ہماری گفتگو سننے والے نے اس ”راز“ کو افسروں تک پہنچا دیا تھا۔ ہم تو اس کے بعد سو گئے مگر بھارتی فوجیوں کی نیندیں اڑ گئیں۔

علی الصبح نماز فجر کے لیے بیدار ہوئے تو فوجی ابھی تک گاؤں میں موجود تھے۔ نوبت کے قریب ارد گرد کے کیمپوں سے مزید فوج پہنچ گئی۔ بم ناکارہ کرنے والے ماہرین ہائی وے پر آلات لے کر بارودی سرنگیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سرنگیں کہیں بھی موجود نہیں تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب فوجی قافلے نے دوبارہ صف بندی کی اور سری نگر روانہ ہو گیا۔ بہت سی گاڑیاں زخمیوں اور لاشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس قافلے نے گٹل باغ کے قریب سے ہو کر جانا تھا۔ میں نے وائرلیس سیٹ پر ابوذر بھائی سے کہا کہ وہ اپنی پیکا گن لے کر سڑک کے کنارے کسی محفوظ مقام پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں، تاکہ بھارتی فوجیوں کا یہ قافلہ بغیر چوٹ کھائے آگے نہ جائے۔ انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا اور جیسے ہی یہ قافلہ وہاں سے گزرنے لگا انہوں نے پیکا کے برسٹ مار کر اس کا ”خیر مقدم“ کیا۔ غرض یہ کانوائے جگہ جگہ پٹتا ہوا سری نگر اس حال میں پہنچا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر مختلف جھڑپوں میں اس کے پچاس فوجی مارے جا چکے تھے، تاہم زخمیوں کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔

بلوندر سنگھ کا چیلنج

گوریلا جہاد میں احتیاط لازمی ہے۔ اس روز احتیاط سے نیچے نہ اترنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا، حالانکہ مجھے خدشہ تھا کہ فوجی کہیں ہمارے راستوں میں گھات لگا کر نہ بیٹھے ہوں۔ ہم نے عطا الرحمن شہید کے جواب میں دشمن کا پچاس گنا زیادہ نقصان کیا، مگر دل پھر بھی ادا اس تھا۔ ہمارے شہید دوست کی لاش پہلے ایک گھر میں پہنچادی گئی تھی، مگر دن کے وقت فوج دوبارہ آکر لاش ساتھ لے گئی۔ فوج نے بعد میں لاش کنگن کی پولیس کے حوالے کر کے ہمارے خلاف اس قتل کا مقدمہ درج کرادیا۔ جواباً مقامی لوگوں نے فوج کے خلاف اسی نوعیت کی رپورٹ کر دی۔ پولیس نے بعد میں عطا الرحمن کالاشہ مقامی افراد کے سپرد کر دیا جنہوں نے اسے بڑی عقیدت و احترام سے کنگن کے مزار شہیداں میں دفن کر دیا۔ فوج کی موجودگی کی وجہ سے ہم جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔ بعد میں کئی بار مزار پر جا کر اپنے شہید دوست کو آنسوؤں اور دعاؤں کے نذرانے پیش کیے۔

ایک دن کنگن کے چند لڑکے میرے پاس آئے۔ انہوں نے کہا کہ آج ۱۵ پنجاب رجمنٹ کا میجر بلوندر سنگھ بستی میں آیا تھا، اس نے آپ کو پیغام بھیجا ہے:

”میں سچے سردار لے کے آیا ہاں“ بے تہاڑے سچے مسلماناں وچ ہمت اے
تے انہاں نال لڑکے ویکھ لین۔“

(میں اپنے ساتھ خالص سکھ لے کر آیا ہوں اگر تمہارے خالص مسلمانوں
میں ہمت ہے تو ذرا ان سے لڑ کر دکھائیں)

میں نے حمزہ سنگریار سے کہا، یہ تو دلچسپ چیلنج ہے، کیوں نہ اسے قبول کیا
جائے۔ انہوں نے بھی میری ہاں میں ہاں ملائی۔ ہمارے خبر رساں لڑکوں نے یہ بھی
بتایا تھا کہ میجر بلوندر سنگھ نے گزشتہ روز مجاہد گل خان کے گھر پر چھاپہ مار کر اہل خانہ
کو بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا اور ستر ہزار روپے بھی چرا کر لے گیا ہے۔ گل خان
ہمارے مقامی ساتھی تھے۔ یہ رقم اس کے والدین نے چند روز پہلے زمین فروخت کر
کے حاصل کی تھی۔ ”سچے سردار“ کی اس گھٹیا حرکت نے ہمارے ارادے کو ممیز
دی۔

میجر بلوندر سنگھ کی نقل و حرکت کے متعلق مکمل معلومات حاصل کرنے پر پتا
چلا کہ وہ گشت کے دوران دن کے تین گھنٹے چند سپاہیوں کے ہمراہ ٹھیون کے قریب
لداخ ہائی وے کے کنارے ایک اونچی جگہ بیٹھتا ہے۔ اس مقام سے پچاس میٹر
فاصلے پر چند گھر تھے۔ وہ فوجیوں کے ذریعے ان گھروں سے جبراً چائے اور کھانے پینے
کی اشیاء منگوا کرتا تھا۔ اس کے پروگرام اور حرکات کی مکمل معلومات حاصل
کرنے کے بعد ایک دن میں اور حمزہ سنگریار چھپتے چھپاتے لداخ ہائی وے کی جانب
سے پہاڑ پر پہنچے۔ میرے پاس پیکا اور دو ربین تھی جب کہ حمزہ سنگریار کے پاس
سناپنگ گن تھی۔ میں نے دو ربین سے دیکھا تو میجر بلوندر اپنے سپاہیوں سے خوش
گپیوں میں مصروف تھا۔ میں نے حمزہ بھائی کو اپنا کمبل دیا تاکہ اپنے لمبے لمبے بال
اس میں چھپالیں، کمبل کے باقی حصے کے نیچے انہوں نے سناپنگ گن چھپائی۔ پھر

ہم نیچے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچھ دور جا کر میں کو ر فائر دینے کے لیے بیٹھ گیا اور
 حمزہ بھائی کو ان کے مشن پر روانہ کر دیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ میں
 دور بین سے حمزہ سنگریار کو دیکھنے لگا۔ وہ چھپتے چھپاتے غیر محسوس طریقے سے گھروں
 کے عقب میں پہنچ گئے تھے۔ وہاں چند عورتیں دھان کی کاشت کے لیے پٹیری نکال
 رہی تھیں، لیکن خوش قسمتی سے حمزہ بھائی پر ان کی نظر نہ پڑی۔ حمزہ بھائی نے کچھ دیر
 گرد و پیش کا جائزہ لیا، پھر وہاں سے آگے بڑھے۔ اس جگہ سے میجر بلوندر کا نشانہ لینا
 مشکل تھا۔ چنانچہ وہ کھیتوں کی منڈھیروں کی آڑ میں آگے بڑھتے ہوئے میجر بلوندر
 سے صرف پچاس میٹر کے فاصلے پر کانٹوں کی ایک باڑھ کی اوٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔
 میں نے دیکھا میجر بلوندر سنگھ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا پٹکا نمایاں تھا۔ وہ اپنا سر
 کھجلا رہا تھا اور آنے والی گھڑی سے بالکل بے خبر تھا۔ تین بے فکرے سپاہی اس
 کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں درخت سے لٹکائی ہوئی
 تھیں۔ اچانک ایک فوجی کی نظر حمزہ سنگریار پر پڑی، اس نے گن کی طرف کھسکنے کی
 کوشش کی، مگر حمزہ بھائی نے اسے تاڑ لیا تھا، اگلے لمحے حمزہ سنگریار کی سناپنگ گن
 نے ایک شعلہ اگلا اور گولی میجر بلوندر کے کندھے میں پیوست ہو گئی اس نے اپنا
 ہاتھ درد سے جھٹکا۔ اتنے میں دوسری گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ کرسی سمیت
 پیچھے لڑھک گیا۔ حمزہ بھائی نے ایک اور فوجی کو بھی ڈھیر کیا اور پھر بڑی تیزی سے
 قریبی نالے میں داخل ہو گئے، پروگرام کے عین مطابق تیزی سے بلندی پر چڑھتے
 ہوئے کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آ پہنچے۔ فوجیوں نے حسب معمول سامنے ہائن
 سکول پر دل کھول کر فائرنگ کی۔ فوج کی فائرنگ جاری تھی، میں حمزہ بھائی کو لے کر
 وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔ ہم نے ”سچے سردار“ کا قرض چکا دیا تھا، اب وہاں رکنے
 کی ضرورت نہ تھی۔

وہاں سے ہم اپنے دیرینہ سرپرست ایک عمر رسیدہ بزرگ کے ہاں پہنچے۔ یہ ہمارے بڑے گہرے دوست تھے۔ ان کا ٹھکانہ پہاڑ پر تھا۔ ان کے پاس ہم نے کھانا کھایا۔ فوج نے بعد میں ہمارے ان بزرگ دوست کو مجاہدین سے تعلق کے جرم میں شہید کر دیا تھا۔ میجر بلوند رنگ کو اپنے ”سچے سرداروں“ کی کارکردگی دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ مگر اپنے ”سچے مسلمانوں“ کی کارکردگی دکھانے کا ہمارا شوق ابھی باقی تھا۔ چند دن تک ہم موزوں موقع کی تلاش میں رہے۔ ٹھیون کے فوجی گیسٹ ہاؤس کے قریب بھی کچھ فوجی افسر اکثر بیٹھ کر خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔ ہماری ان پر بھی نظر تھی۔ ہمارے خبر رساں ساتھیوں نے بتایا کہ ایک کرنل بھی ایک آدھ گھنٹے کے لیے وہاں آتا ہے۔ ہم نے خود بھی ان کے معمولات کا جائزہ لیا، جب اچھی طرح معلومات حاصل کر لیں تو ایک روز ہم دونوں چھپتے چھپاتے اسی پہاڑ کے اوپر پھر پہنچے۔ دورین سے نیچے دیکھا تو کرنل فوجی افسروں کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔ حمزہ بھائی نے اصرار کیا کہ آج بھی یہ کام وہی کریں گے۔ ان کی خواہش کے احترام میں مجھے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ وہ پانی کے نالے کی آڑ لیتے ہوئے کچھ دیر بعد بھارتی فوجیوں کے عقب میں کھیتوں میں جا پہنچے۔ افسر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے سامنے جنگل کے قدرتی منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کوئی ان پر پیچھے سے حملہ بھی کر سکتا ہے۔ حمزہ بھائی نے ایک کھیت کی منڈھیر پر پوزیشن لیتے ہی درمیان میں بیٹھے ہوئے افسر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کے فوراً بعد وہ اٹھے اور بھاگتے ہوئے نالے میں غائب ہو گئے۔ چند منٹ بعد فوجیوں نے جوابی فائرنگ کا آغاز کیا تو حمزہ بھائی ان کی پہنچ سے دور جا چکے تھے۔ تاہم حمزہ بھائی نے جس افسر کو کرنل سمجھ کر نشانہ بنایا تھا بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایک کیپٹن تھا۔ حمزہ بھائی میرے پاس پہنچے تو گولوں اور گولیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اگلے روز ایک بریگیڈیر

اس جگہ معائنہ کے لیے آیا۔ اس نے پورے وثوق سے کہا کہ نالہ سندھ کے بالکل سامنے ہائن کے سکول سے یہ فائر ہوا ہے۔ اس کے خیال میں اس طرف سے ممکن ہی نہیں کہ اتنی زیادہ فوج کی موجودگی میں کوئی آتا اور فائر کر کے بچ نکلتا۔ یہ افواہ بھی پھیلی کہ فائر سکول کے اندر سے ہوا اور ایک برقعہ پوش خاتون نے کیا ہے۔ یہ دلچسپ افواہیں ہم بھی سنتے اور لطف لیتے رہے۔ اس کے بعد فوج نے مزید ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے یہاں ایک کیمپ قائم کر دیا۔

ایک ماہ تک میں اور حمزہ بھائی اسی علاقے میں اکٹھے رہے۔ باقی ساتھی کنگن کے دوسرے علاقوں میں مقامی مجاہدین کے ہمراہ مصروف جہاد تھے۔ ہماری کوئی مستقل کمین گاہ نہیں تھی۔ ہم نے ایک خیمہ خرید کر جنگل میں رکھ لیا تھا۔ برسات کے دن تھے۔ بارش ہوتی تو ہم کسی اونچی جگہ پر خیمہ لگا کر رات گزار لیتے تھے۔ کھانا وغیرہ مختلف بستیوں سے آجاتا تھا۔ ٹھیون میں چند کارروائیاں کرنے کے بعد ہم کاوا چلے گئے۔ کاوا میں چند مقامی مجاہد بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ کاوا میں چند دن ادھر ادھر پھرنے کے بعد ہم کنگن چلے گئے اور کنگن شہر کے مضافات کے جنگل میں پناہ گاہ بنالی۔ ایک دن ہم نے یہیں بیٹھ کر کنگن کے مرکزی کیمپ کو نشانہ بنانے کا پروگرام بنایا۔ یہ کیمپ کنگن کے قریب لداخ ہائی وے کی دونوں جانب واقع ہے۔ حملے سے پہلے اس کیمپ کی اچھی طرح ریکی کی گئی۔ طے پایا کہ حمزہ بھائی کیمپ کے قریب جا کر سناپنگ گن سے حملہ کریں گے۔ میں اپنی پیکا گن لے کر کچھ فاصلے پر بیٹھوں گا، تاکہ جوابی حملہ ہو تو کور فائر دے سکوں۔ مقامی مجاہدین کو بھی میں نے مختلف مقامات پر کور فائر کے لیے بٹھا دیا۔ میں کیمپ سے دو سو میٹر دور پیکا گن لے کر ایک اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اس وقت مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب حمزہ بھائی کیمپ کی طرف بڑھے۔ کیمپ کے باہر ایک بنکر تھا جس میں ایک فوجی کھڑا تھا۔

انہوں نے ایک دیوار کی اوٹ سے نشانہ لے کر پہلے اسے ڈھیر کیا، کچھ آگے بڑھے تو کیمپ کے قریب تین دوسرے فوجی کھڑے دیکھے، ان پر انہوں نے چند فائر داغے اور پھر طے شدہ پلان کے مطابق تیزی سے واپس میرے پاس پہنچ گئے۔ ہم دونوں وہاں سے نکلے، ساتھیوں کو سیٹی بجا کر نکلنے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر میں سب خیریت سے جنگل میں پہنچ گئے۔ کنگن کے فوجی کیمپ سے جنگل کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ رات گئے ہم کاوا پنچے، ایک گھر میں کھانا کھایا اور پھر جنگل میں جا کر سو گئے۔

چند دن تک ہم کاوا ہی کے علاقے میں رہے۔ یہ اکتوبر ۱۹۹۴ء کے ابتدائی دن تھے۔ وہی پرانے معمولات تھے، گاؤں سے کھانا کھایا اور جنگل میں کسی درخت تلے رات سو کر گزار دی۔ دشمن چالاک ہو گیا تھا۔ ہماری اکثر ترکیبیں فوج کو معلوم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ایک دن میں نے حمزہ بھائی سے کہا کیوں نہ ایک نئے طریقے سے کارروائی کریں۔ انہوں نے میری تجویز سنی تو ہنستے ہوئے اتفاق کیا۔ اگلے دن مغرب سے کچھ قبل میں نے حمزہ سنگریار کو کنگن کے فوجی کیمپ سے چند سو میٹر اوپر ایک محفوظ مقام پر روشنی کے گولے دے کر بٹھا دیا۔ خود میں نے پیرکا سنبھالی اور ایک سنان راستے سے ہوتے ہوئے فوجی کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیمپ سے پانچ سو میٹر کے فاصلے سے آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں گھروں کے ساتھ باغیچے بنے ہوئے ہیں جب کہ قریب ہی کھیت بھی ہیں۔ ان دنوں دھان کی فصل اٹھالی گئی تھی اور کھیت خالی پڑے تھے۔ میرے پاس پلاس بھی تھا، جس سے میں باغیچوں کے گرد لگی خاردار تاریں کاٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مغرب کی اذان کے وقت میں کیمپ سے ساٹھ میٹر کے فاصلے پر واقع ایک گھر کے قریب کھڑا تھا۔ چند منٹ تک وہاں کھڑے قریبی بنکر پر حملے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ محض ہراس پھیلانے کے لیے۔ حملے کے لیے اس بستی کے گھروں سے موزوں کوئی جگہ نہ تھی۔ فوجی

اس کا تصور نہ کر سکتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ خاموشی سے کسی گھر کی چھت پر پہنچ جاؤں۔ میں نے قریبی گھر کو دیکھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ افراد خانہ کی آوازیں کچن کی طرف سے آرہی تھیں۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہو گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ گھر کے اندر کی سیڑھیوں سے ہو کر چھت پر جا کر فائر کروں گا، لیکن جیسے ہی میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا مجھے غسل خانے کا کھلا دروازہ نظر آ گیا۔ غسل خانے کے روشن دان کے اندر سے بیس میٹر کے فاصلے پر کیمپ کا وہ بکر بالکل سامنے نظر آرہا تھا جو میرا ہدف تھا۔ روشن دان قدرے اونچا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا تو لکڑی کی ایک کرسی دکھائی دی جسے میں نے بڑی خاموشی سے نیچے رکھا اور روشن دان کے اندر پیکا گن رکھ کر کرسی پر کھڑا ہو گیا۔ کچن سے بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور میری نظریں بکر پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد بکر کے اندر سے ایک فوجی بڑبڑاتا ہوا یا ہر آیا۔ دوسرے فوجیوں پر اظہار ناراضی کرتے ہوئے وہ کیمپ کی طرف چل پڑا۔ اس کے معاً بعد ایک دوسرا فوجی باہر نکلا اور پہلے فوجی کو آواز دینے لگا۔ اسی لمحے میری گن نے ایک شعلہ اگلا اور گولی سیدھی اس فوجی کے سینے پر جا کر لگی۔ نیچے کی طرف اترائی تھی، وہ تقریباً پندرہ فٹ تک اترائی میں قلابازیاں کھانے کے بعد منہ کے بل گر گیا۔ میرا کام ختم ہو گیا تھا، میں بجلی کی تیزی سے غسل خانے سے نکلا اور قبل اس کے گھر کے مکین مجھے دیکھ سکتے، میں بھاگتا ہوا دروازے سے نکل کر باغیچے میں پہنچ گیا۔ وہاں سے میں نے وہی راستہ اختیار کیا جدھر سے آیا تھا۔ حمزہ سنگریا نے فائر کی آواز سنتے ہی روشنی کے دو ٹریس فائر کر دیے تھے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ روشنی کے گولے فائر کرتے ہی جگہ تبدیل کر دیں۔ ہم دشمن کو یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئے کہ حملہ جنگل کی جانب سے ہوا ہے، اس لیے کہ جلد ہی فوج نے توپوں اور مارٹر گنوں کے دہانے کھول دیے۔ جنگل پر اتنے

زیادہ گولے پھینکے کہ پورا علاقہ دھوئیں سے بھر گیا۔ یہی ہم چاہتے تھے کہ کیمپ میں خوف و ہراس پھیلے اور دشمن کا اسلحہ ضائع ہو۔ تاہم مجھے اپنے ساتھی کے متعلق اس وقت تک فکر لاحق رہی جب تک میں نے انہیں کچھ دیر بعد بخیریت دیکھ نہ لیا۔ یہ رات ہم نے جنگل ہی کے ایک محفوظ مقام پر گزار دی۔

ان ہی دنوں کا واقعہ ہے ایک دن عبدالرحمان بھائی مقامی مجاہدین کے ہمراہ کنگن کے ایک گاؤں میں اہم مشاورت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ عین اس وقت فوج سے بھرے دو ٹرک وہاں آ گئے۔ اس وقت تک میٹنگ ختم ہو گئی تھی اور چند مجاہد باہر سڑک پر آ چکے تھے۔ ٹرک سڑک پر آ کر ر کے تو ان سے بے خبر ایک مجاہد گن لیے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ ٹرک کی اگلی سیٹ پر بھارتی فوج کا کیپٹن بیٹھا تھا۔ اس نے مجاہد کو دیکھا تو ایک مقامی شخص کو اشارے سے کہا اس مجاہد کو میرے پاس بھیجو۔ مجاہد سادگی سے کیپٹن کے بلانے پر گاڑی کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ گاڑی سے چند فٹ دور ہی تھا کہ اس کی نظر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہتھیار بند فوجیوں پر پڑی تو اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا اس نے فوراً کلاشن کوف نکالی اور سامنے آ کر کیپٹن کو گولیوں سے بھون ڈالا اور خود جنگل کی طرف فرار ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز سن کر دوسرے مجاہد بھی محفوظ طرف نکل گئے۔

اسی عرصے میں ایک واقعہ شکیل بھائی اور تین دوسرے مجاہدین کے ساتھ کنگن کے گاؤں پنزن میں پیش آیا۔ وہ چاروں گاؤں سے باہر نکل رہے تھے کہ گھات میں پھنس گئے۔ چاروں طرف سے فوج نے انہیں محاصرے میں لے لیا تھا۔ نکلنے کی راہیں مسدود پا کر انہوں نے بڑی بے جگری سے ایک گھنٹے تک مقابلہ کیا۔ پانچ فوجی ہلاک کرنے کے بعد وہ سب شہید ہو گئے۔ شکیل بھائی کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی اور ان کا تعلق خوشاب (پاکستان) سے تھا۔

ارض پاک کی جانب

نومبر ۱۹۹۴ء کے پہلے ہفتے میں جب سردی کا موسم شروع ہو رہا تھا اور سامان جہاد کم پڑ گیا تھا، ہم نے پاکستان واپسی کے لیے ارادہ باندھا۔ وائرلیس سیٹ پر گاندریل میں ساتھیوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے بھی پاکستان جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ہمارے ساتھیوں میں سے صرف اخلاق بھائی کنگن میں رہ گئے۔ میں، حمزہ شگریار، ذکی گوریلا، محمود غزنوی، طاہر سلیم اور ابن سیفل کے ساتھ گاندریل پہنچا۔ وہاں عادل شہباز، عمر انقلابی، سیف اللہ اور شہباز مل گئے۔ چار دن تک ہم بابا صالح، کرہامہ اور واکپورہ کے علاقوں میں رہے۔ اس کے بعد ہم دس پاکستانی اور چار کشمیری ساتھی سوناواری پہنچے۔ سوناواری کی جھیل کو کشتی کے ذریعے عبور کرنے کے بعد ایک ٹرک کے ذریعے بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ایک چھوٹی سی بستی میں اترے۔ وہاں سے پیدل نائید کھائی کی بستی میں پہنچے۔ یہ بستی مخبروں کا گڑھ تھی، اس لیے ہم یہاں رکے بغیر آگے روانہ ہوئے۔ رات بھر کے سفر کے بعد ولر جھیل کے کنارے پہنچے۔ رات ہم نے کشتیوں اور کنارے پر بنی جھونپڑیوں میں بسر کی۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے غریب ملاحوں نے مہمان نوازی اور بہترین

اخلاق کا اظہار کیا۔ اگلے دن کشتی کے ذریعے ولر جھیل میں سفر جاری رہا۔ جھیل کے کنارے کنارے کشتی میں سفر کرتے ہوئے بانڈی پورہ کے سامنے جنگل میں پہنچے۔ یہاں ایک بہت بڑا ڈیری فارم ہے۔ یہ رات ہم نے ڈیری فارم پر گزاری۔ یہاں بھی ہماری خاطر مدارت کی گئی۔ اگلے دن ولر جھیل میں تین گھنٹے تک کشتی کا مزید سفر کرنے کے بعد بانڈی پورہ کی ایک مضافاتی بستی میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں چند گھنٹے آرام کر کے جنگل کی ایک پگڈنڈی پر دوبارہ آغاز سفر کیا۔

رات بارہ بجے شدید سردی میں ہم ایک ایسے مقام پر تقریباً گر پڑے، جہاں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ مقامی ساتھیوں نے حوصلہ دلایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک پناہ گاہ ہے مگر ہم میں چلنے کی سکت نہ تھی۔ اس پر انہوں نے کہا ہم وہاں سے چائے اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتے ہیں۔ ہمیں وہاں چھوڑ کر ہمارے وہ بھائی چلے گئے۔ دو گھنٹے تک برف پر پڑے ہوئے ہم ان کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آئے۔ شدید سردی نے دوبارہ سفر شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ فجر کی اذانوں کے وقت ہمارے ساتھی سامنے سے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے ہاتھ میں گھی کا ایک ٹین پکڑا ہوا تھا جس میں ہمارے لیے چائے تھی۔ یہ چائے پی تو جان میں جان آئی اور آگے چلنا شروع کر دیا۔

دن کے تیسرے پہر ہم اس مقام پر پہنچے جہاں سے پاکستان روانگی کے لیے کسی رہنما کو ساتھ لینا تھا۔ دو روز تک انتظار کرتے رہے لیکن کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ چنانچہ تیسرے روز مغرب کی نماز پڑھ کر بغیر رہنما کے جنگل کی ایک پگڈنڈی پکڑی اور لولاب کی طرف روانہ ہو گئے۔ برف اور اندھیری رات میں نہایت کٹھن اور پر خطر سفر کرتے ہوئے لولاب کی ایک بستی میں پہنچے، جہاں حزب المجاہدین کے سیکشن کمانڈر حمید شاہ نے ہماری خاطر تواضع کی۔ ہمیں لانچ ہونے کے لیے گائیڈ کی

ضرورت تھی، ان سے گائیڈ کے لیے بات کی۔ ہمارا رابطہ انہوں نے ”البرق“ کے چیف کمانڈر سے کرا دیا۔ چند دن تک ہم ”البرق“ کے مہمان رہے۔ وہاں ”البرق“ کے مجاہد شیر خان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ ”البرق“ کے ساتھی بھی ہمارے لیے گائیڈ کا انتظام نہ کر سکے تو ہم لاچار ڈوبن سے گاگل پہنچے، جہاں میجر مست گل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہلے ہی فروکش تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ چند دن بعد ان کے ہمراہ پاکستان روانہ ہونے کی ایک کوشش کی لیکن وہ بھی ناکام ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ہم سب راجواڑ کے علاقے میں چلے گئے۔ وہاں دس دن تک لانچنگ کا انتظار کرتے رہے۔

میجر مست گل اور ان کے ساتھی تو پاکستان واپسی کا پروگرام موخر کر کے چرار شریف روانہ ہو گئے اور ہم نے پاکستان جانے کی کوشش جاری رکھی۔ بالآخر ہمیں گائیڈ فراہم ہو گیا۔ جس کی رہنمائی میں ہم نے پاکستان کے لیے دوبارہ رخت سفر باندھا۔ دو دن بعد ہم ایک رات لائن آف کنٹرول سے چند سو میٹر کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ہم سے صرف دو سو فٹ اوپر بھارتی فوج کی پکٹ تھی۔ تھکان، بھوک اور شدید سردی نے ہمیں بے حال کر دیا تھا۔ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ ایک ایسی جگہ پر نظر پڑی جو برف سے خالی تھی تو سب وہاں گر پڑے۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ ہم سب وہاں بیٹھے آسمان اور فوجی پکٹ کو گھور رہے تھے۔ باتیں کرنے پر بھی پابندی تھی، اچانک دیکھا سامنے چند گز کے فاصلے سے ایک شخص گزر رہا ہے۔ سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رات کے اس پہر ایک ویران جگہ پر کسی انسان کا گزرتا ناقابل فہم تھا۔ ہم اپنی اپنی جگہ سانس روکے پڑے رہے۔ ہماری معمولی نقل و حرکت سامنے سے گزرنے والے شخص کو ہماری طرف متوجہ اور پکٹ میں موجود فوجیوں کو چوکنا کر سکتی تھی۔ اس وقت ہمارے پاس محض چند

پستول تھے، بڑے ہتھیار ہم نظم کے پاس جمع کرا آئے تھے۔ محض اللہ کی مدد نے ہمیں اس موقع پر کسی آزمائش سے بچا لیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے ایک بار پھر سفر شروع کیا۔ ایک جگہ راستے میں چند مجاہدوں کے برف میں دبے ہوئے لاشے دیکھے، ہاتھ اٹھا کر ان کی بلندی درجات کی دعا کی۔ ہمارے لیے ان کے قریب جانا ممکن نہ تھا کہ وہ بلند مرتبہ لوگ بہت نیچے برف کی گہری کھائی میں ابدی نیند سوئے تھے۔ راہ حق میں ایسے بہت سے فدائی ہیں جن کے جنازے اٹھے اور نہ کہیں مزار بنے اور جن کے نام بھی شاید تاریخ کے کسی صفحے کی زینت نہیں بنیں گے، لیکن وہ اپنے پیاروں کے دلوں میں زندہ ہیں اور ان کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔

گرتے پڑتے ۳ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ہم نے لائن آف کنٹرول عبور کی۔ سرزمین پاک پر پہنچ کر اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا جس نے ہمیں اپنی راہ میں جہاد کرنے کی توفیق دی۔